جلد ۴۸ — جنوری ۱۹۵۷ء — عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط (الاعراف: ٢٦)

(اے اولادِ آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا کہ تمہارا ستر ڈھانکے اور تمہارے بدن کو زینت بخشے)

خوش پوشی کے لیے

لٹھا : نفیس ، موتی محل

پاپلین : کے آر ۲۲۷-۱۰۱-پی

ڈریس فیبرکس : سوہنی

[illegible] - لان - کیمرک اور کریپ

KTM

KOHINOOR TEXTILE MILLS LIMITED
RAWALPINDI

کوہ نور
راولپنڈی

KTM/ 6-77

SCAD

فہرست مضامین

جلد ۸۸	جنوری ۱۹۷۸ء مطابق محرم ۱۳۹۸ھ	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ۴۱۱۰۱۶ ـــــ ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اشارات ذرا مختلف مبحث پر لکھ چکا تھا کہ ملک کے سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب ضیاء الحق کا بیان (پریس کانفرنس منعقدہ یکم جنوری ۱۹۷۸ء بمقام اسلام آباد) پردۂ سماعت پر مرتعش ہوا۔

میں سمجھتا ہوں کہ پوری قوم کے لیے یہ سالِ نو کا تحفہ ہے اور جناب ضیاء الحق کے الفاظ میں سال ۱۹۷۸ء اسلامی نظام کا سال ہے۔ پہلے سالِ اقبال، پھر یوم قائداعظم، اور بعدازاں اسلامی نظام کا سال بہت مبارک ترتیب ہے۔ آج پہلی بار ملت کی تمناؤں کا قدم قراردادِ مقاصد (۱۲۔ مارچ ۱۹۴۹ء) سے واضح طور پر آگے بڑھا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارے اجتماعی وجود کے ان بے شمار زخموں پر مرہم رکھا گیا ہے جو نفاق زدہ منحرفین اسلام نے ہر اہم مرحلہ پر اسلام کے نغمے الاپ الاپ کر ہمیں پہنچائے ہیں۔ ہمیشہ اپنے ہی رہنماؤں کے ہاتھوں لٹتے رہنے والے قافلے کو پیشرو قوت کی طرف سے پہلی بار خلوص و دیانت کا امید افزا تجربہ ہوا ہے۔

میں اس موقع پر سربراہ مملکت اور پوری قوم کو اور خصوصاً ترجمان القرآن کے قارئین کو مبارکباد کہتا ہوں، اور یہ مبارکباد اس دُعا کا خلاصہ ہے کہ خداوند کریم آغاز شدہ سال کو ہمارے لیے باعث برکات بنائے اور قافلۂ نظام اسلامی تیز رفتاری سے جادہ پیمائی کرے، ہونے والے کام ایسے خلوص و بصیرت سے انجام پائیں کہ قرآنی تہذیب کے حقیقی برگ و بار ہمارے دامن مقدر میں پہنچیں، نیز مانعین و محرّفین کی شرارتیں اور مزاحمتیں اور باہر کی اسلام دشمن قوتوں کی سازشیں غبار راہ بن کر پریشان ہو جائیں۔ جس خدا نے پاکستان کو وجود دیا وہ جبر و استبداد اور خیانت و خباثت اور مکر و کید کے علمبرداروں کی پیدا کردہ آفات

سے اہل پاکستان کو بچا نکالے، اسلام دشمن نظریات و تحریکات کی منحوس پرچھائیوں سے ہمارے افکار و اعمال کو آزاد کرائے، دورِ رفتہ جس اقتصادی خستہ حالی کے گڑھے کے کنارے پر سات کروڑ عوام کو کھڑا کر گیا ہے۔ اس کو پاٹ کر ہمیں سلامتی سے آگے بڑھنے کا موقع دے اور اس مملکت کے امراء کو زرپرستی اور عیش مستی سے اور اس کے اسی فیصد غریبوں کو افلاس، بیکاری، بیماری، جہالت، ذلت، جرائم، مایوسی، خوف، اخلاقی زوال اور سماجی جمود کی بلاؤں کے پنجوں سے چھڑائے۔ اس سرزمین پر حکومت، انتظامیہ، دینی حلقوں اور سیاسی جماعتوں کو مل جل کر ایسا ماحول بنانے کی توفیق دے جس میں بھلائیاں آسانی سے نشو و نما پائیں، اور برائیاں مرجھا کے رہ جائیں۔ وہی صاحب عرشِ عظیم علماء کو مذہبی فرقہ آرائی سے، سیاسی اکابر کو صوبائی، لسانی اور نسلی عصبیتوں سے، اہلِ کاروبار کو منافع پرستی سے، صنعت کو سرمایہ و محنت کی طبقاتی آویزش سے، اور زراعت کاروں کو زمیندار اور مزارع کی نزاع سے نجات دلائے۔ اس کے کرمِ خاص سے علم و تحقیق میں، پیداوارِ دولت میں اور دفاعی قوت میں تیزی سے اضافہ ہو۔ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم میں سے ہر فرد اپنا اپنا کام اس شعور کے ساتھ انجام دے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں ملنے والے مقدس مشن کا ایک کارکن ہے اور وہ ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے حق کی شہادت دینے والا نقیب اور باطل کے خلاف جہاد کرنے والا ایک سپاہی ہے۔ اس کی بہترین توجہات اسی نصب العین پر مرتکز ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ثانوی ہے۔

بارالٰہا! جو کچھ انفرادی اور اجتماعی قصور ہم سے اب تک ہوئے ہیں ان سے درگذر فرما اور اب جب کہ پوری قوم کی طرف سے تیرے راستے پر چلنے کا اعلان و اقرار ہو رہا ہے، تو بہ تائیدِ خاص اس اقرار و اعلان کو جامۂ عمل پہنانے کی توفیق بھی ہمیں دے۔ تو ہمارے سامنے سلامتی کی تمام راہوں کو روشن اور واضح فرمائے، اور ان پر بغیر کسی کوتاہیِ فہم اور درماندگیِ عمل کے، سفرِ فرض طے کرنے میں خصوصی مدد فرما! رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔

اے نور السمٰوات والارض، پاکستان کو اقامتِ دین کی راہ میں جو مقامِ اولیت تو نے ہمیں مادیت کے اس تاریک دور میں عطا کیا ہے، اس پر تیرا شکر ادا کرتے ہوئے ہم تمنائی ہیں کہ اس رتبۂ سعادت کا حق ادا کرنے کے لیے ہمیں شایانِ شان صلاحیتیں بھی دے اور ہمارے بچے بچے کو اخلاص سے سرشار اور سرگرمِ عمل

بنا دے۔ آمین ثم آمین۔

یکم جنوری سے سالِ شمسی کا جو مبارک آغاز ہوا ہے، اس کے زیرِ اثر ہم خداوند قدوس و قدیر سے پورے عالمِ اسلام کے لیے فلاح و سعادت کی تمنا کرتے ہیں۔

اے تقدیر سازِ ہر ذرۂ کائنات، ہمارے عرب بھائیوں کو اسرائیل کی چیرہ دستیوں سے تحفظ دلا، مسئلہ فلسطین کا بہترین منصفانہ حل پیدا کر دے تاکہ تباہ شدہ اہلِ فلسطین کو ان کے حقوق واپس ملیں اور عربوں کے مغصوبہ علاقے واگذار ہوں، اور بیت المقدس پر مسلمانوں کی تولیت اور نظامت حسبِ سابق قائم ہو، الخلیل توہین کرنے والوں کی گرفت سے نکلے، دریائے اُردن کے مغربی کنارے پر یہود کی جو نئی بستیاں ایک شرپسندانہ منصوبے سے بسائی گئی ہیں، وہ حرفِ غلط کی طرح لوحِ خطہ سے مٹ جائیں ـــــ اور ان مقاصد کے حصول تک (اور اس کے بعد بھی) عرب حکمران اور ان کے عوام اتحاد کی ایک مضبوط دیوار بنے رہیں اور حال ہی میں اس دیوار میں جو دراڑیں آئی ہیں، وہ پٹ جائیں۔

اے ہر ذی روح کی پیشانی کے بالوں پر گرفت رکھنے والے فرمانروا! ایتھوپیا (حبشہ) کے مظالم سے اریٹریا اور صومالیہ کے مسلمانوں کو محفوظ فرما۔ قبرص کے ترکوں کو سالہا سال سے ستم ڈھانے والے یونانیوں کی چالوں سے مستقل طور سے بچاؤ کر دے۔ فلپائنی مسلمان جس طویل المیعاد عقوبت سے گذر رہے ہیں اس سے انہیں نکال کر انہیں ایک آزاد خطہ عطا فرما۔

اے کارسازِ ملتِ حق! تو مسلمانانِ عالم کو توفیق دے کہ ان کی ہر مملکت میں اقامتِ دین کا آغاز ہو جائے اور وہ سب ایک مشترک اسلامی منشور پر جمع ہو کر اسے جامۂ عمل پہنانے کے لیے دوش بدوش اقدام کریں ـــ عالمِ اسلام کے ہر خطے کو بیرونی نظریاتِ فاسدہ اور علوم باطلہ اور ثقافتِ جاہلیہ کے غیر محسوس لشکروں کے حملے کے مقابلے میں اپنی پناہ مہیا فرما، نیز فکری و علمی، سیاسی و معاشی اور اخلاقی و ثقافتی دائروں میں مسلمانوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ ایمان و شعور کے ساتھ غیر اسلامی عوامل کے خلاف معرکۂ جہاد برپا کریں۔ اور مادہ پرستانہ تہذیب کے تمام اصول و اقدار کا سر کچل ڈالیں۔ تیری عنایتِ خاص ہو تو پندرھویں صدی ہجری کے آغاز تک کرۂ ارضی کے تمام مسلمان مل کر اس قابل ہو جائیں کہ وہ دنیائے انسانیت کو فسق و فساد سے نکال کر فلاح و سلامتی کے مقام تک لانے کے لیے شہداء علی الناس بن کر کھڑے ہو سکیں۔

ایک نئی آواز مشرق و مغرب میں گونج اٹھے، نئے مبحث چھڑیں۔ نئے علم لہرائیں، نئی شمعیں روشن ہوں۔ نیا نظام قائم ہو۔ نئی دنیا بنے اور نیا انسان ظہور پذیر ہو۔

اے تاریخ انسانی کے کارفرما! اے وقت کو گردش دینے والے! اے خیر و شر اور زوال و کمال کے ادوار کو بدلنے والے! موجودہ لادینی مادہ پرستانہ دور کا خاتمہ فرما جس نے نوعِ انسانی کو وطنوں اور نسلوں اور طبقوں میں بانٹ دیا ہے۔ جس نے انسان کو حیوانیت کے مقام پر لا گرایا ہے۔ جس نے دنیا بھر کو خوف اور مایوسی اور پریشانی اور اضطراب اور تصادموں سے بھر دیا ہے، جس نے سائنس کے مہیا کردہ اسبابِ خدمت کو ہلاکت اور بیماری اور اعصابی اضمحلال کے ذرائع میں بدل دیا ہے، جس نے عورت کو آزادی و ترقی کے نعروں سے مسحور کر کے مردوں کی ہوس کا شکار بننے کے لیے رندانہ ثقافت کے رنگین غلاظت خانوں میں عریاں کھڑا کر دیا ہے۔

الٰہ العلمین ــــ خالق انسانیت! ربِ اقوام و ملل! اس عالمگیر دورِ تہذیب کے جہنم سے اولادِ آدم کو بچا نکال! آمین۔

سربراہِ مملکت کے مبارک اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے، یہ کہنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ موقع ایسا تھا کہ دو ایک اور ضروری امور کے متعلق بھی قول فیصل سامنے آجاتا۔

نظامِ تعلیم کو تبدیل کرنے کا عزم تو پہلے ہی ظاہر کیا جا چکا ہے، اور اس مقصد کے لیے نامور ماہرین کی ایک وسیع کانفرنس منعقد کرا کے تفصیلی کام کمیٹیوں کے سپرد ہو چکا ہے (اور غالباً اب تک ان کی طرف سے رپورٹیں مرتب ہو کر آ بھی گئی ہوں گی)۔ بایں ہمہ کچھ فوری نمایاں اقدامات جلد تر عمل میں لانے کے لیے اعلانات جنوری (۱۹۷۸ء) ہی میں یہ بات کہہ دی جاتی تو اس کا خاص اثر ہوتا۔ مثلاً اتنا فیصلہ تو بہ آسانی سنایا جا سکتا ہے کہ قرآن کی تعلیم پورے درسی نظام میں ابتدا تا آخر اس نئے مفہوم میں لازم ہو گی کہ گریجوایشن حاصل کرنے والے طلبہ قرآن کا اچھا خاصا تفسیری علم حاصل کر سکیں۔[1]

---

[1] قرآن کو بہ حیثیت مستقل مضمون، یا "اسلامی حکمتِ حیات" کے وسیع تر نصاب کے ایک اہم جزو یا ترکیبی کی حیثیت سے تو لیا جانا ہی چاہیے، لیکن اس کے علاوہ یہ ضروری ہو کہ جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، علم الاخلاق، علم تعلیم، (باقی بر صفحہ ۶)

تبدیلی کو محسوس شکل دینے کے لیے نہایت مناسب ہوتا کہ تعلیمی سال ۱۹۷۸ء کے آغاز سے پچھلے سال کے وعدہ کے مطابق جامعۂ خواتین کے عملی قیام کا دو ٹوک اعلان کر دیا جاتا۔

اسی طرح اُردو زبان بھی خاص توجہ چاہتی تھی۔ تعلیمی کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں کا کام اپنی جگہ، اس اہم مسئلے پر سربراہِ مملکت کا اعلان بڑی اہمیت رکھتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قائداعظم کی تاکیدوں، تحریک پاکستان کے مواعید و اعلانات اور قوم کے ذہین عناصر کے بار بار کے مطالبوں کے باوجود تیس برس میں یہ کام نہ ہوسکا، اور اب تاخیر کی وجہ کیا ہے جب کہ محترم جسٹس انوار الحق پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ عدلیہ کارروائیوں کی زبان کے طور پر اردو کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ پھر نظامِ تعلیم اور دفتری نظام اور کاروباری دنیا کو کونسی معذوری لاحق ہے کہ ان حلقوں میں اُردو زبان کو جاری نہ کیا جاسکے[1]

درسگاہوں میں آخری مرحلے تک ذریعہ تعلیم اُردو ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ ایف اے سے اُوپر بعض طلبہ کو انگریزی میں بھی امتحان دینے کی سہولتیں دی جاسکتی ہیں۔ سوائے اس کے کچھ طلبہ استثنٰی کے لیے درخواست دے کر اجازت لیں، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے تھیسس اُردو ہی میں لکھے جانے چاہییں۔ مگر یہ استثنٰی چند سال کی عبوری مدت کے لیے ہونا چاہیے۔ نصابیات کی انگریزی کتابوں کے لیے ۲ سال کی مدت ترجمے تیار اور شائع کرانے کے لیے کافی ہے۔ آخر یہ کام عثمانیہ یونیورسٹی بھی کر چکی ہے اور کراچی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) قانون، مدنیات، اقتصادیات اور سائنس (بیالوجی، فزیالوجی، جیالوجی، کیمسٹری، علم نباتات و حیوانات، علم زلزلات و طبقات الارض، علم کائنات و اجرام فلکی و فضا وغیرہ سبھی اس میں شامل ہیں)۔ اور دوسرے جو علوم بھی ہمارے ہاں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق قرآن کی آیات تفسیر و تبیین کے ساتھ مرتب کر کے ہر مضمون کے ساتھ اضافی قرآنی کورس شامل کر دیا جائے۔ تب جا کر ہم یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں قرآن کو مرکزی اہمیت دے کر پڑھایا جا رہا ہے۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) دفتری نظام کی بیماری صرف یہ ہے کہ اس کے انگریزیت زدہ افسران اور اہل کار کی پوزیشن اُردو کے آتے ہی خراب ہو جائے گی۔ ان کے ماتحت جو انگریزی میں اُن سے دبتے ہیں، اردو میں فوقیت رکھتے ہیں اور افسران کو اپنے ماتحتوں کا شرمندۂ احسان ہونا پڑے گا۔

میں انجمن ترقی اُردو کے کالج میں بھی یہ تجربہ کامیاب رہا ہے۔ ؎

کہ مرداں پیش ازیں بودند و ہستند

ایک معاملہ متعلق قادیانیوں کا بھی ہے۔ دستوری فیصلہ ہو چکا، مگر اس کے تقاضے قانونی پیرائے میں بھی تو سامنے آنے چاہئیں۔ بعد ازاں انتظامی لحاظ سے جو کارروائیاں ہونی چاہئیں وہ عمل میں لانے ضرورت ہوگی۔ جن لوگوں کا ماضی میں قادیانی ہونا مشہور رہا ہے اور جن اشخاص کے متعلق سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں اپنی قادیانیت کو مخفی رکھنے کا شبہ کیا جاتا ہے (اور وہ ربوہ اور قادیانی حلقوں اور لٹریچر سے تعلق رکھتے ہیں) ان سے ایک مناسب حلف نامے پر دستخط لے کر معلوم کرنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں یا قادیانی۔ یہ کام التوائے مسلسل میں پڑا ہوا ہے۔ اس طرح کے ادھورے اقدام اور معلق معاملات بسا اوقات بہت مضر پڑتے ہیں۔

ایک بڑا قضیہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ادارات کی اصلاح ہے۔ ان اہم ترین قومی ذرائع ابلاغ پر جن ذہین و زیرک اصحاب کا پُرانا قبضہ ہے، ان میں مخالفِ اسلام نظریات کے قائل اور خالص ملحد تک موجود ہیں، ان میں مغرب پرست سیکولرسٹ بھی شامل ہیں، ان میں نرے مفاد پرست اور تنخواہ پرست قسم کے افراد بھی ہیں۔ ان میں عریانی و فحاشی پھیلانے کے مشن کی خدمت کرنے والے جنسی مریض بھی ہیں، نیز سابق قیادت کے خیر اندیش بھی اپنی اپنی جگہوں پر جمے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے ملغوبہ اسٹاف کو لے کر اسلامی اصول و اقدار کے فروغ کی مہم کو مشکل ہی سے کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ اگر ظاہر و باہر قسم کے پروگراموں میں جا بجا اسلام کا پیغام دیتے بھی ہیں تو ساتھ ہی دانشورانہ پروگراموں میں خاصی نشتر زنی بھی کر جاتے ہیں۔ جبھی تو ٹیلی وژن میں دوپٹہ سروں کے چوتھے حصے سے آگے قدم نہیں بڑھا سکا۔ نیز مستقل عملے سے باہر کی جو خواتین مکالموں، گانوں اور ڈراموں میں جلوہ فرما ہوتی ہیں وہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر کے کھلے سر، کھلے سینہ اور کھلے بال اپنی فتنہ سامانیوں سے دیکھنے والوں کو نوازتی ہیں۔

دوسرا بگاڑ یہاں یہ کام کر رہا ہے کہ کچھ اجارہ دار قسم کے لوگ بار بار پروگراموں میں آتے ہیں، کچھ وہ ہیں جن کو برائے "وزنِ بیت" تھوڑا بہت موقع ملتا رہتا ہے، اور تیسری صنف ایسے علماء، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ہے جن کے لیے ریڈیو، ٹیلی وژن کے دروازے خالص سیاسی وجوہ سے بند ہیں۔

ستم یہ کہ یہ دَور جو سیاسی تعصبات سے بالاتر ہے اور چاہا جا رہا ہے کہ قوم کے ہر طبقے کی بہترین صلاحیتوں (TALENTS) کو روبعمل لایا جائے اس میں بھی پچھلے دَورِ حکومت یا اس سے بھی پچھلے ادوار کے معتوبین اسی جگہ ہیں جہاں تھے۔ غلط نظریات رکھنے والوں کی تو ٹھیکہ داریاں چل رہی ہیں اور صحیح نظریات اور کردار رکھنے والے بے شمار اشخاص جو آج بہترین پارٹ ادا کر سکتے تھے اپنے مقامِ خود داری پر خاموش بیٹھے ریڈیو سنتے اور ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔

چاہیے یہ تھا کہ تمام ان شہروں میں جہاں کوئی نشرگاہ ہے، وہاں کے علماء، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں میں سے ایک ایک دو دو افراد (جو کمیونسٹ یا مغرب پرست یا بھٹوازم کے مسحورین نہ ہوں) پر مشتمل ایسی رضاکارانہ کمیٹیاں تشکیل دی جاتیں جو پروگراموں میں شرکت کرنے والے اور نہ کرنے والے اصحابِ علم و شعور کی فہرستوں کو سامنے رکھ کر حکومت اور متعلقہ محکموں کو توجہ دلائیں کہ کیا تبدیلیاں ہونی چاہییں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کمیٹیوں میں پروگراموں پر بھی بحث و تنقید ہوتی اور وہ اپنے تاثرات حکومت اور نشرگاہوں کے ڈائرکٹروں کو بھجوا دیتیں۔ ان رپورٹوں میں واضح کیا جا سکتا ہے کہ کون سے پروگرام غیر جانب دار دانشور حضرات کی نگاہ میں اسلام کے فروغ کے لیے مفید اور کون سے ضرر رساں ہیں۔

نشرگاہوں کی اصلاح کے لیے ایسا کوئی فیصلہ (اعلان یکم جنوری کو ہو جاتا تو بہت مبارک ہوتا۔

اسی طرح اخبارات کا معاملہ ہے۔ ضابطۂ اخلاق کی بات تو ہو گئی مگر اسے نافذ کرنے والی مشینری مہیا نہیں ہو سکی۔ اگر اب اس کا اعلان ہو گیا ہوتا تو بھی اچھا تھا۔

ہونا یہ چاہیے کہ روزناموں، ہفت روزوں اور ماہناموں میں سے ہر شہر میں ایک ایک دو دو افراد کو حکومت نامزد کر کے ایک مجلس میں جمع کرتی اور ان سے کہہ دیتی۔ آپ لوگ ضابطۂ اخلاق کی مشینری ہیں۔ ان کا ایک کام تو یہ فرض ہوتا کہ یہ ہر خبر، ہر اداریہ، ہر سُرخی، ہر کارٹون پر نظر رکھتے اور جب کسی اخبار کی کسی چیز کو غلط محسوس کرتے تو اسے لیٹر (یا نوٹس) جاری کر کے وضاحت طلب کرتے اور اگر وضاحت قابلِ اطمینان نہ ہوتی تو اس کی باقاعدہ تردید یا معافی کے الفاظ شائع کرنے کی ہدایت کرتے۔ اسی مشینری کے سامنے ہر اخبار کسی دوسرے اخبار کے خلاف اور سیاسی اور دینی شخصیت اور حکمران گروہ کے افراد اور عام شہری بھی اپنی شکایات بھیج سکتے، اور نمائندہ مجلس ہر شکایت پر مناسب کارروائی کرتی۔ (باقی بر صفحہ ۴۸)

جامعہ خواتین کیوں اور کس طرح؟

از جناب نعیم صدیقی صاحب

ملتِ پاکستان، اور خصوصاً اس سرزمین کی مسلم خواتین کے لیے یہ بہت ہی خوش آئند لمحۂ فکر یہ ہے کہ موجودہ عبوری حکومت نے معاشرے کے ایک کچلے پسے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے جامعہ خواتین (ایک یا زائد) کے قیام کا ارادہ کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ الحاد پسند قوتیں رخنہ اندازی کی کوششوں میں ناکام ہوں۔

یہ محض عام یونیورسٹیوں کی طرح ایک اور یونیورسٹی قائم ہو جانے کا معاملہ نہیں، بلکہ یہ اقدام سیکولر ذہنوں کی مسلط کردہ شب دیجور کی چادرِ سیاہ میں ایک ایسا شگاف ہوگا جس سے روشنی کی رکی ہوئی شعاعوں کا تیز و تند بہاؤ ایک آبشار کی طرح شروع ہو سکتا ہے اور جب یہ تجویز جامۂ عمل پہن لے گی ——— بشرطیکہ اسے ایمانی شعور کے ساتھ وسیع مفہوم اور بھرپور شکل میں جلوہ گر کیا جائے ——— تو مصورینِ فرنگ اور مقلدینِ تہذیبِ دوں نہاد کی تعمیر کردہ کانچ کی تمام دبیز دیواریں منہدم ہونے لگیں گی جو ہمارے لیے راہِ حق میں حائل ہو گئی ہیں۔

ہمیں جو دنیا بنا کر دی گئی ہے ——— وہ سیاست و معیشت سے لے کر تعلیم و ثقافت تک ——— سیکولر اور مادہ پرستانہ مفاد طلبی اور لطف اندوزی اور عیش مستی کی دنیا ہے۔ تمام علوم میں، تعلیمی نصابوں میں، عام پسند لٹریچر میں، ناولوں اور افسانوں میں، شاعری اور موسیقی میں، عریاں تصویروں اور فلموں میں یہی زہر ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اس تدریج سے پچھلی دو تین صدی کے عرصے میں زہر خورانی کا شکار بنایا گیا ہے کہ اب "ہیروئن" (HEROIN) کے فریفتگان کی طرح یہ زہر ہمارے لیے نشہ و سرور کا لازمی ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم اس راہ سے ہٹ کر سوچ نہیں سکتے، قدم آگے نہیں بڑھا سکتے، ہزارہا اعتراض اور شکوک و اوہام میں گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی ہم اسلام کے کسی اصول یا اس کی کسی قدر کا احیاء کرنا چاہتے ہیں، گریز کے سیکڑوں بہانے، فرار کے ہزاروں راستے دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی کھل جاتے ہیں۔ ہمارے

ملک کے علاوہ بیشتر دوسرے مسلمان ممالک میں بھی انگریزی یا کسی دوسری مغربی حکومت نے سیکولر طرزِ فکر پیدا کرنے کی مہم کے ساتھ ساتھ ایسا اہتمام کیا کہ سیکولر ذہن کے طبقے کو معاشرے کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ اور جب اس کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو قافلہ آزادی کی سربراہی کے لیے اس طبقے کو خود سہارا دے کے اس نے اقتدار کے گھوڑے پر چڑھایا تا کہ اسلام کو تمدنی زندگی سے بے دخل کرنے کا جو لمبا کام وہ بڑی حد تک کر چکی تھی، اس کے بعد بھی اس کی تکمیل کے مراحل طے ہوتے رہیں، اور کم سے کم علمی، تعلیمی اور ثقافتی سامراج بدستور کام کرتے رہے۔ چنانچہ ہماری قریبی تاریخ گواہ ہے کہ مصر میں، ترکیہ میں، انڈونیشیا میں، پاکستان میں، جہاں بھی کہیں احیائے اسلام کی تحریک نے سر اٹھایا، فوراً مغربی سامراج کے سیکولرسٹ ورثا اپنی پوری شانِ مسلمانی کے ساتھ زنجیریں اور مشین گنیں، سولیاں اور پھانسیاں لے کر آگے بڑھے اور اسلام اور مسلمانوں کی سچی خدمت کرنے والوں کا بے دریغ خون بہایا۔

پاکستان میں آپ نے نہیں دیکھا کہ جب اوّل اوّل اسلامی دستور کا عوامی مطالبہ زور پر آیا تو حکمرانوں نے معاشرے کے گراں قدر عنصر پر غداری اور تخریب کے الزامات لگائے اور ان کے لیے زندانوں کے در کھول دیے۔ پھر جب قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی مہم ۵۳ء میں شروع ہوئی تو اسے کچلنے کے لیے گولیوں اور سنگینوں اور سلاسل اور تازیانوں کی پوری قوت استعمال کر دی گئی۔ تمام جیل بھر گئے، حکومت تہ و بالا ہو گئی، مگر قادیانیت نوازی میں فرق نہ آیا، جس کی خاطر اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لاکھوں افراد مختلف اذیتوں اور نقصانوں کا نشانہ بنے۔ عائلی قوانین میں تحریفی عمل دورِ ایوبی میں کیا گیا۔ اس کے خلاف علما کے ردّعمل پر شدید گرفت کی گئی۔ حتیٰ کہ عید کے چاند کے مسئلے میں اختلاف رائے واقع ہونے پر چند ممتاز عالموں کو محبوس کر دیا گیا۔ یوں بھی مجموعی طور پر دیکھیں تو پاکستان میں اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کی قربانیوں اور ان کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی میزان ہر دوسرے عنصر سے زیادہ بنتی ہے۔

یوں ہماری اسلامی ریاست پر سیکولرازم فرماں روا ہے۔ اور وہ بس اسلام کو اس حد تک گوارا کرتا ہے کہ اس کے نعرے لگتے رہیں، اس کے لیبل غیر اسلامی اقدامات پر چپکائے جائیں، اور جواب میں وہ داعیانِ اسلام سے چاہتا ہے کہ وہ اس کے ہر اقدام کو اسلامی ثابت کرنے والے فتوے اور مقالات لکھتے رہیں۔ اس حالت سے نکلے بغیر نہ اسلام رُو بہ عمل آسکتا ہے، اور نہ ہم اسلام کے خلاف سیکولرازم کی کشمکش کو برقرار رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں "کیوں" کا جواب دیتے ہوئے مقاصد بیان کیے

جائیں گے، اور دوسرے حصے میں "کس طرح" کے جواب میں تجویز کو جامۂ عمل پہنانے کی صورت مذکور ہوگی۔

حصۂ اوّل ــــــ مقاصد

اب مسئلہ یہ ہے کہ خواتین و طالبات کی تعلیم تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی، پھر آخر ان کے لیے علیحدہ یونیورسٹی کیوں؟ دوسرے لفظوں میں وہ مقاصد کیا ہیں جن کی بنا پر جامعۂ خواتین کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب میں مقاصد جس منطقی ترتیب سے بیان ہونے چاہییں، اُسے چھوڑ کر سب سے پہلے ہم خواتین اور طالبات کے مفاد کے لحاظ سے جامعہ خواتین کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہیں۔

خواتین کے حق میں ایک زیادتی کا ازالہ مخلوط تعلیم کے کالجوں میں طلبہ کی اکثریت کے ساتھ طالبات کی اقلیت ایک طرح کی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ طالبات بالعموم الگ گروہوں اور ٹولیوں میں رہتی ہیں۔ ان کے لیے داخلے کے وقت نشستیں علیحدہ متعین ہوتی ہیں۔ زیادہ تر کلاس روم میں بھی سیٹیں الگ ہوتی ہیں۔ ان کے کامن روم بھی الگ ہوتے ہیں۔ یونینز میں بھی ان کی نشستیں علیحدہ معین ہوتی ہیں۔ ان کے لیے کچھ خاص پابندیاں اور قیود ہوتی ہیں۔ طالبات کے ہوسٹلوں کا انتظام بھی سخت تر ہوتا ہے۔ ان کے لیے بعض ضوابط بھی الگ ہوتے ہیں۔ نیز منتظمین، اساتذہ اور دوسرے عملۂ دفتر کا رویّہ بھی طالبات کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی طالبات دبی دبی رہتی ہیں اور ثانوی حیثیت میں رہنے کے دباؤ کا مقابلہ محض تیز طرار جلوں اور شوخ و شنگ حرکات سے نہیں ہو سکتا۔ اندریں صورت مخلوط تعلیم کے علمبردار اور حامی جو فوائد پیش نظر رکھتے ہیں، وہ بھی پوری حاصل نہیں ہوتے، اور مخلوط تعلیم کے مخالفین جو نقصانات بتاتے ہیں، ان کا کچھ حصہ بھی طالبات اور معاشرے کے پلّے پڑتا ہے۔

اگر سیدھی طرح خواتین کے لیے جداگانہ تعلیم گاہوں کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو جامعات اور کلیات کے ہر دائرے میں خواتین بلا مداخلتِ غیرے بے تکلفی سے حصہ لے کر فوائد سے بہرہ مند ہو سکتی ہیں۔ طالبات اپنی کلاس میں خاتون لیکچرر سے ہر قسم کے سوالات پوچھنے اور ہر قسم کے سوالات کے جوابات دینے میں بڑی آسانی محسوس کریں گی۔ یہ تو ایک مصیبت ہے کہ ہر بات کرتے ہوئے دوسری صنف کا تصور ذہن میں آجائے کہ اس کا ردّ عمل کیا ہوگا۔

کلاس روم کے علاوہ، مختلف تقاریب میں، جلسوں میں، کھیلوں میں، لائبریری میں، کیفے ٹیریا میں ہر جگہ طالبات ہر قسم کے ذہنی تحفظات اور احتیاطوں سے ہٹ کر پوری آزادی سے اپنا پارٹ ادا کر سکیں گی۔ اصل معاملہ مجموعی

شخصیت کے نشوونما کا ہے جس کی کمی زیادہ نمبر لینے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ مخلوط نظامِ تعلیم میں لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کی شخصیتوں کا نشوونما غیر متوازن ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جامعاتِ خواتین عورتوں اور لڑکیوں کو زیادہ بہتر تعلیم اور زیادہ حقیقی ترقی بہم پہنچانے کا ذریعہ ہوں گے۔ ان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں زیادہ اچھی طرح نشوونما پائیں گی اور ان کا ایمانی و اخلاقی معیار آج سے دسیوں گنا برتر ہوگا۔

خواتین کو پوری توجہ سے اس امر کا نوٹس لینا چاہیے کہ اصلاً مخلوط نظامِ تعلیم —— بلحاظِ نظریات و مقاصد، اور بلحاظِ نصابیات —— انگریزی دَور سے ہی لڑکوں کے لیے تیار کیا گیا ہے — یہ بڑی زیادتی ہے کہ خواتین کی مخصوص صلاحیتوں (جن سے مرد بہرہ مند نہیں ہیں) اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے طالبات کو اُٹھا کر مردانہ نظامِ تعلیم کی گود میں پھینک دیا جائے — گویا نظامِ تعلیم کی نگاہ میں اصل چیز مرد ہیں اور ساری اہمیت اُن کی ہے۔ کسی لڑکی کو اگر تعلیم پانی ہو تو مردوں کے لیے جو انتظام کیا گیا ہے اُسی سے فائدہ اُٹھائے۔ اس کی اپنی صنف کی اتنی قدر و قیمت نہیں ہے کہ خاص اس کے لیے درسگاہوں اور اساتذہ اور نصابیات کا موزوں انتظام کیا جائے۔ عورتوں کو اگر تعلیم حاصل کرنی ہو تو انہیں صرف مردانہ معیار اور طرز کی تعلیم بہم پہنچائی جا سکتی ہے، اور اگر انہیں ترقی کرنی ہو تو وہ صرف مردانہ مشاغل اور مردانہ کاموں کے ذریعے ہو سکتی ہے، نیز انہیں مردوں کے لیے ایوانِ ثقافت میں سامانِ تفریح بننا ہوگا۔ کوئی دوسرا راستہ تعلیم و ترقی کا نہیں ہے — فی الحقیقت سامراج نے ہر دوسرے دائرہ زندگی کی طرح شعبۂ تعلیم میں بھی مردوں کو بے جا برتری دی ہے۔ مگر بس اتنا ہے کہ "مساواتِ مرد و زن[1]" کے بے معنی نعرے کا خوشنما پردہ ذہنوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ سامراج کا

---

[1] قانونی و اخلاقی مساوات الگ چیز ہے جس کا اسلام خود اولین علمبردار اور بہترین نمونہ ہے۔ کامل مساواتِ مرد و زن کا مغالطہ انگیز نعرہ لگانے کے لیے جسمانی و عضوی (BIOLOGICAL)، اعصابی (NERVOUS) اور نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) فروق و امتیازات سے آنکھیں بند کر لینا لازم ہے۔ جدید علمی، عضوی، سائنسی اور نفسیاتی تحقیقات تو حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن مغرب کے سوشل نظام کے سیاسی علمبردار اور اُن کے حامی فلسفی اور بعض فلسفہ طراز سائنس دان نسائیت کو مغالطے کے ایک پھندے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مساوات کے نعرے سے ایک اور عملی نعرہ پیدا ہوتا ہے: "دوش بدوش"۔ بس اسی دوش بدوش کی پٹاری میں جدید انتشار انگیز معاشرت کے سانپ اور بچھو چھپے ہوئے ہیں۔

بنایا ہوا قفسِ تعلیم دَورِ آزادی میں بھی جوں کا توں رہا اور ہمارے اپنے کارپردازوں نے بھی عورتوں کو مردوں کا تابع مہمل بنا کر علم و ترقی کی راہ پر چلایا۔

مردوں سے بڑھ کر خود خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو برطانوی سامراج کے تاسیس کردہ مردانہ نظامِ تعلیم کے قفس سے، جس پر مخلوط تعلیم کا بورڈ لگا دیا گیا ہے، پوری قوت صرف کر کے نکالیں۔ معاملہ محض یونیورسٹی کی الگ عمارت کا نہیں کہ یہاں سے اُٹھے اور وہاں جا کے بیٹھ گئے، جو علمی شعبے جس ترتیب سے یہاں کام کر رہے تھے اسی ترتیب سے وہاں اُن استوار کر دیا گیا۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ خواتین و طالبات کی اپنی آزاد تعلیمی دنیا ہو جس میں وہ کلاس روم کی نصابی تعلیم سے لے کر قومی دفاع کی مشقوں تک، اور علمی مباحثوں اور ادبی مجالس سے لے کر کھیل کے میدان اور جوڈو[1] کراٹے کی تربیت تک دوسری صنف کی مداخلت سے آزاد ہوں۔

خواتین، اساتذہ اور طالبات دونوں اپنے اپنے دائروں میں پورا نقشۂ کار اپنے رجحانات کے مطابق خود طے کریں اور ہر قسم کے انتظامات کو خود چلائیں اور اپنی مشکلات پر خود قابو پائیں ——— خلاصہ یہ کہ خواتین کے لیے جداگانہ جامعات (UNIVERSITIES) اور کلیات (COLLEGES) کا قیام ان کا بہت بڑا استحقاق ہے۔

پردہ پسند خواتین کی اکثریت کی ضرورت

پردے سے انحراف کرنے والی چند ہزار خواتین کو چھوڑ کر بقیہ غالب اکثریت اس معنی میں پردہ پسند ہے کہ وہ برقعہ استعمال کرے یا چادر سے کام چلائے، پورا وقت خانہ داری اور نئی نسل کی تربیت کو دے، یا مجبورانہ حالات میں گھر سے باہر کسی طرح کی محنت مزدوری کرے۔ بہرصورت وہ شرم و حیا، عصمت و پاکدامنی اور غیر محرم مردوں سے خلط ملط رکھنے اور بے تکلف ہونے میں شدید احتیاط کے اصولوں کی باغی نہیں ہے۔ وہ اسلامی معاشرت کی قدروں کو خود بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے، اور اپنی اولاد کو بھی جدیدیت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچانا چاہتی ہے۔

خواتین کی اکثریت سخت مشکل سے دوچار ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد مخلوط تعلیم اور اس کے نتائج و اثرات کے پیشِ نظر خود بھی مخلوط تعلیمی اداروں میں نہیں آتی، اور اپنی اولاد کو بھی اُن کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ پردہ پسند

---

[1] واضح رہے کہ موجودہ فاسد ماحول میں تحفظِ ناموس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ خواتین خود حفاظتی تدابیر کے لیے اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں۔

خواتین تین راستے اختیار کیے ہوئے ہیں۔

——— کچھ خواتین گھروں میں بچیوں کے لیے تعلیم کا کافی یا ناکافی انتظام کر کے یا تو اُن کو پرائیویٹ طور سے امتحانات دلواتی ہیں، یا امتحانات پاس کرانے سے بے نیاز رکھتی ہیں۔

——— کچھ خواتین جو غریب اور محبِ اسلام گھروں سے تعلق رکھتی ہیں، بطور خود گھروں میں تعلیم کا انتظام کرنے کے قابل نہیں ہوتیں، مگر مخلوط تعلیمی اداروں میں اولادوں کو بھجوانے کے مقابلے میں انہیں جاہل رکھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

——— کچھ وہ ہیں جو اپنی بچیوں کو بادلِ نخواستہ مخلوط نظامِ تعلیم کے حوالے کر دیتی ہیں مگر اس تکلیف دہ احساس میں مبتلا رہتی ہیں کہ ہم نے نئی پود کو خطرات کی زد میں دے دیا۔ اب اگر بچاؤ کا دار و مدار ہے تو خدا کی خصوصی عنایت پر ہے۔ ایسی بچیوں میں سے کچھ تو پردے کے ساتھ تعلیم گاہوں میں جاتی ہیں، مگر چند ہی روز میں ان کی ہمتِ برقعہ پوشی جواب دے جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں جو ہر روز گھر سے برقع پہن کے جاتی ہیں مگر کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار دیتی ہیں۔ اور پھر واپس روانہ ہوتے ہوئے پہن لیتی ہیں۔ یہ روز کا عملی تضاد ان کے ذہن و کردار کی ساخت کو تباہ کر دیتا ہے۔ ایک تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جس میں پردے کے خلاف باقاعدہ بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوط تعلیم ایک ایسا چھرا ہے جس نے خواتین کی اکثریت اور اس کی اولادوں کی تعلیمی ترقی کو ذبح کر دیا ہے اور یکے بعد دیگرے بچیوں کی جو صفیں اٹھتی چلی آ رہی ہیں اُن سب کے حق میں یہ مذبوحی حرکت مسلسل جاری ہے۔

صدہا گھروں اور لاکھوں خواتین اور بچیوں کو یہ مشکل درپیش ہے کہ مخلوط تعلیم اُن کی ترقی کے راستے میں پہاڑ بن کر حائل ہے۔ اُن کی آواز اس لیے سُنائی نہیں دیتی کہ اُن کے آگے چند ہزار با اثر، دولت مند، تعلیم یافتہ، لکھنے اور بولنے اور لیڈری کرنے والی ماڈرن خواتین تنظیمی قوت کے ساتھ کھڑی ہیں۔ ماڈرن خواتین و بیگمات کو کئی سال سے قومی لیڈروں اور سرکاری افسروں کی سرپرستی اور فنڈز کی امداد اور پروپیگنڈے کی قوتوں اور قومی ذرائعِ ابلاغ کی خدمات کی پشت پناہی حاصل ہے۔ انہوں نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ایسا اثر جما لیا ہے جیسے پورے پاکستان کی خواتین کی ترجمانی کا اجارہ انہی کے پاس ہے۔ حالانکہ یہ مغرب کے تہذیبی سامراج کی ایجنٹ بن کر پاکستانی خواتین کی اکثریت کے ایمانیات اور مطلوبات کو نمایاں ہونے سے روکتی ہیں، اور یہ محسوس کراتی ہیں کہ جو رنگ انہوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے علاوہ پاکستان میں کوئی دوسرا انسانی رنگ موجود

ہی نہیں ہے۔ اور اگر موجود ہے تو اُس کے لیے ان کے دلوں میں احترام تو کجا، رواداری بھی باقی نہیں۔ یہ اکثریتی رنگ کو بالکل کاٹ دینا چاہتے ہیں۔

اب اگر کوئی بہتر قیادت یا حکومت مظلوم اکثریتی طبقۂ اناث کو سامنے رکھے تو ملک کی ترقی اور قوم کی بہبود کا اس سے تقاضہ یہ ہے کہ وہ خواتین وطالبات کے لیے الگ تعلیم گاہوں کا انتظام کرے۔[1]

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ خواتین کے لیے الگ جامعات وکلیات کا ظہور ہوتے ہی بہت سی ایسی خواتین اور طالبات نئی تعلیم گاہوں کی طرف رجوع کریں گی جو مخلوط تعلیم کے نتائج واثرات سے خائف ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ تعلیمی ترقی کے نتیجے کے طور پر اقتصادی اور اخلاقی ترقی کی رفتار بڑھے گی۔

مخلوط تعلیم کے مفاسد سے نجات

مخلوط تعلیم کا نظام خود ہماری تہذیب کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نشوونما پانے والی ملحدانہ ومادہ پرستانہ تہذیب کی اولاد ہے۔ اسے ہم آزادانہ ذہن کے ساتھ بھلا بُرا سوچ کر اور اپنے تہذیبی تشخص کی ضروریات کو سمجھ کر باہر سے خود پسند کر کے نہیں لائے، بلکہ اسے ہم پر ٹھونس دیا گیا ہے۔ یہ ہماری آئیڈیالوجی، ہمارے عقائد اور ہمارے اپنے معاشرے کے اندر سے نہیں اُگا ہے، بلکہ ایک مصیبت ہے جو باہر سے لاکر ہمیں اوڑھا دی گئی ہے۔ ہمیں صیادوں نے جبراً اس قفس میں ڈالا، اور اب ہم خوگرِ قفس ہو گئے ہیں۔

اندریں صورت، اگر پہلے کبھی ہم اس کا ناقدانہ جائزہ نہیں لے سکے تو اب لینا چاہیے اور اس کے مفاسد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمارا دین اور ہمارا قومی تہذیبی وجود اور ہمارا معاشرتی مزاج اُسے ساتھ لے کے چل سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جائزہ لینے میں آپ کو حسبِ ذیل نکات مدد دیں گے۔

---

[1] اسلامی نقطۂ نظر سے سوچنا تو الگ بات ہے، ہمارے پڑوسی بھارت نے محض قومی افادیت کے نقطۂ نظر سے اُس طبقۂ خواتین کا خاص لحاظ کیا جو روایتی ہندو معاشرے کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ ایسی کثیر التعداد خواتین مخلوط تعلیم کے دائرے میں مرد طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر خود تعلیم پانا یا اپنی بچیوں کو پڑھانا پسند نہیں کرتیں۔ اُن کے لیے آج سے ۲۰، ۲۵ سال پہلے دو الگ یونیورسٹیاں (WOMEN UNIVERSITIES) قائم کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک ایس، این، ڈی، ٹی ویمن یونیورسٹی ہے جس کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں چار کالجوں کا الحاق کیا گیا تھا۔ (بحوالہ پمفلٹ مخلوط تعلیم از اصلاحی) علاوہ ازیں امریکہ تک میں عورتوں کے لیے الگ یونیورسٹیاں موجود ہیں۔

۱۔ صنعتی انقلاب اٹھا تو اس نے نہایت ہی دیرینہ اور مضبوط و مستحکم مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو ہلا کر رکھ دیا۔ تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کے اس مرحلے میں کوئی ایسی قوت موجود نہ تھی جو نوخیز خرابیوں کی اصلاح کر کے صنعتی انقلاب کو صحیح رُخ پر ڈال دیتی۔ سیاسیات، اقتصادیات، فلسفہ، مذہب، اخلاق اور نظامِ معاشرت، ہر چیز تہ و بالا ہو گئی۔ اِسی انقلاب کا ایک حلیہ مخلوط معاشرت ہے، کیونکہ نئی مشینی قوت نے دیہاتیوں کو گاؤں گاؤں سے نکالا اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی گھروں سے کارگاہوں میں مزدوری کرنے کے لیے منتقل کر دیا۔ یوں مخلوط معاشرت کی بنیاد پڑی، اور اس کے نتیجے میں صنفین کے جداگانہ تعلیمی انتظامات ختم ہو کر مخلوط تعلیم کا سلسلہ فروغ پانے لگا۔

آیئے ذرا آپ مخلوط تعلیم کی تاریخ پر نگاہ ڈال لیں[1]۔

—— چین کے کسی گذشتہ دور میں مخلوط تعلیم کا سُراغ نہیں ملتا[2]۔

—— مغرب کے دورِ جدید کے ابتدائی حصّے تک (۱۴ ویں صدی کے آغاز سے ۱۸ ویں صدی کے اوائل تک) مخلوط تعلیم کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں تھا۔ مستقل نظام کی حیثیت سے اس کی ابتدا ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں ہوئی[3]۔

—— مخلوط تعلیم کو اختیار کرنے میں امریکہ سب سے آگے رہا۔ مروجہ اصطلاح (CO-EDUCATION) نے امریکی لغت کے بطن سے جنم لیا ہے جو اوّلاً ۱۸۴۲ء میں استعمال ہوئی[4]۔

امریکی معاشرہ جن عناصر سے ترکیب یافتہ تھا، ان میں ایک تو مذہبی تنازعات سے تنگ آکر وطن چھوڑنے والے لوگ تھے، دوسرے مفرور مجرم، تیسرے ہوسِ دولت کی رَو میں نئی دنیا کی طرف لپکنے والے عناصر۔ ان کی عمریں ۵ سے ۴۰ سال تک تھیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے معاشرے اور خاندانوں کی روایات اور مذہبی و اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھے۔ ان میں غالباً عورتوں کی تعداد کم تھی اور "گرسنہ مردوں" کی تعداد زیادہ۔ ایسے

---

[1] قلّتِ وقت کی وجہ سے بطور خود ازسرِنو تحقیق و مطالعہ کا لمبا کام کرنے کے بجائے میں نے بعض مندرجات کے لیے پہلے سے موجود کام پر انحصار کیا ہے۔ اور بیشتر اقتباسات یا اعداد و شمار مستعار لے لیے ہیں۔ بہ طور خاص برادر عزیز احمد انس کے پمفلٹ "مخلوط تعلیم" مطبوعہ ادارہ مطبوعات طلبہ، ا۔ ۱۵ ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں سے۔

[2،3] مخلوط تعلیم۔ ص ۱۸ تا ۲۰ [4] مخلوط تعلیم ص ۲۲

بے تکے معاشرے میں جہاں منشیات، زناکاری (اور حرام اولادیں) قمار بازی، لوٹ مار کے جرائم پروان چڑھے (اور ان جرائم کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں) وہاں مخلوط معاشرت اور مخلوط تعلیم کا تجربہ بھی زور شور سے شروع ہوا۔[1]

—— انگلستان میں ۱۸۷۰ء اور ۱۹۰۲ء کے قوانین میں مخلوط تعلیم کا راستہ کھولا گیا۔ مگر اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ شرفاء اور معززین نے اپنے بچے ان اسکولوں میں بھیجنے پسند نہ کیے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ۱۳۹۱ مدارس میں سے صرف ۳۹۴ مخلوط تھے۔[2]

—— فرانس میں مخلوط تعلیم کی اجازت صرف اسی صورت میں دی گئی کہ لڑکیوں کی تعداد ۵۰ سے کم اور لڑکوں کی ۱۰۰ سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ الگ سکول کھولنا لازمی ہوگا۔ ایک ماہرِ تعلیم میئر (MEYER) اپنی کتاب "بیسویں صدی میں تعلیم کا ارتقاء" میں لکھتا ہے کہ مخلوط تعلیم کو فرانس میں بالعموم پسند نہیں کیا جاتا۔[3]

—— ۱۸۸۱ء میں جب فرانس میں لازمی تعلیم کا آغاز ہوا تو قاعدہ یہ مقرر ہوا کہ پانچ سو کی آبادی میں لڑکیوں کا ایک علیحدہ سکول لازماً قائم کیا جائے گا، نیز تیرہ سال کی عمر کے بعد مخلوط تعلیم نہیں ہوگی بلکہ علیحدہ علیحدہ انتظامات کیے جائیں گے۔[4]

—— جنوبی امریکہ میں جو لوگ چرچ اور کانونٹ کے اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دلا سکتے تھے، وہ مخلوط تعلیم کے اسکولوں میں داخلے نہیں دلواتے تھے۔[5]

—— روس میں انقلاب کے بعد ۲۰ سال تک مکمل مخلوط تعلیم کا تجربہ کیا گیا۔ پھر جب عملاً خوفناک نتائج سامنے آئے تو اسے ترک کر دیا گیا۔ نیا طرزِ فکر یہ تھا کہ "مخلوط تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کے جسمانی نشوونما اور مستقبل کی عملی زندگی کے لیے دونوں جنسوں کی تربیت میں فرق و اختلاف کا لحاظ نہیں رکھتی، اور نہ عملی اور فوجی سرگرمیوں میں دونوں کی الگ الگ ضروریات کا اہتمام کر سکتی ہے۔ نیز طالب علموں میں مطلوبہ نظم و ضبط کی ضمانت بھی نہیں دیتی۔"[6]

اس مطالعہ تاریخ کی روشنی میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزاد صحت مند فضا میں پروان چڑھنے والے کسی مذہبی عقیدے یا فلسفیانہ نظریے پر مخلوط تعلیم کی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ صنعتی انقلاب کے مہیا کردہ ہنگامی اور غیر معتدل بلکہ فاسد احوال نے اس غیر فطری نظامِ تعلیم کو پروان چڑھایا اور معاشروں کی حقیقی پسند کے خلاف تدریجاً ان پر مسلط کیا ہے۔

---

[1]، [2]، [3]، [4]، [5]، [6] مخلوط تعلیم از احمد انس ص ۲۲ تا ۲۸ -

مخلوط تعلیم کے جواز اور افادیت کے نظریے اور فلسفے ساتھ کے ساتھ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے چلے گئے۔

ہم مسلمانوں کا نظام معاشرت اور تصور انسانیت تو دوسری اقوام سے زیادہ بلند اور بہتر ہے، لیکن یہ حقیقت بہت سبق آموز ہے کہ بہ حیثیت مجموعہ انسانیت مخلوط تعلیم کو پہلے سے ناپسند کرتی تھی۔

(۲) مخلوط تعلیم کا لازمی نتیجہ جنسی غلاظت ہے[1]۔

چند سال قبل کے حقائق پیش خدمت ہیں۔ یہ ایک رپورٹ سے ماخوذ ہیں جو امریکہ کے مخلوط تعلیمی اداروں کی اخلاقی حالت کا جائزہ لینے کے لیے لکھی گئی تھی۔

—— ڈاکٹر ہوبرٹ ہیکوز کا اندازہ ہے کہ "مخلوط کالجوں میں، لڑکوں کے کالج کے قریب واقع لڑکیوں کے علیحدہ کالج میں ۸۰٪ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے سے قبل جنسی تجربات سے گذر چکی ہوتی ہیں"۔

—— ونسٹنٹن کا اندازہ ہے کہ شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنے والی لڑکیوں میں کالج کی طالبات کا تناسب ایسی طالبات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جنہوں نے کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔

—— ورجینیا کے ایک چھوٹے سکول کی فارغ التحصیل طالبات کے اپنے بیانات سے پتہ چلا کہ ۷۵ سے ۸۵ فی صد تک لڑکیاں جنسی تعلقات قائم کر چکی ہوتی ہیں۔

—— مشی گن یونیورسٹی کے طلبہ کا اپنا اندازہ ہے کہ گریجوایٹ ہونے تک بمشکل ۲۰٪ اور بعض کی رائے میں ۳۰٪ لڑکیاں جنسی تعلقات سے بچ کر نکلتی ہیں۔

—— اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں سے ہر ۶ کے اندر ایک شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو چکی ہوتی ہے۔

—— سراکو یونیورسٹی کی ۶ ہزار طالبات میں اوسطاً ۴۰۰ سالانہ حاملہ ہوتی ہیں (حالانکہ اس افتاد سے بچاؤ کے لیے سائنس اور طب نے طرح طرح کے مانع حمل ذرائع بہم پہنچا رکھے ہیں)۔

—— قبل شادی جنسی تعلقات قائم کرنے والی طالبات میں سے ۲۰ سال کی عمر تک ۱۳٪ پوری طرح بار آور ہوتی ہیں۔

—— کوئینز کالج کی ایک طالبہ نے بطور فخر خود یہ کہا کہ میں نے حال ہی میں اپنے خاتمۂ عصمت کی

---

[1] آگے کی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو مخلوط تعلیم ص ۲۷ تا ۴۹ -

سالگرہ مناتی ہے۔

ذاتی مطالعہ و علم کی بنا پر میں ایک برطانوی درس گاہ کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک پاکستانی مسلمان لڑکی کی شلوار کے پائنچے اُٹھا کر ہم جماعت لڑکے نے کہا کہ ارے تمہاری ٹانگیں تو بہت خوبصورت ہیں، تم انہیں چھپا کے کیوں رکھتی ہو اور اسکرٹ کیوں نہیں پہنتیں۔

مغرب سے آنے والے معلوماتی انگریزی جرائد میں شائع ہونے والے دو مزید واقعات بھی قابل ذکر ہیں :۔

اسکول کی سطح کی ایک اُستانی کو یہ تجربہ پیش آیا کہ کم عمر لڑکے نے اچانک اُس کا اسکرٹ اُٹھا کر باطن کا جائزہ لیا۔ بچاری استانی پہ جو گذری سو گذری وہ موجودہ قواعد کی رُو سے بچے کو جھڑک بھی نہیں سکتی، کیونکہ اسکولوں میں جنسی موضوع پہ ہر بات پوچھنے اور جاننے کی اور ظاہر کرنے کی آزادی ہے اور طلبہ کو ڈانٹنے ڈپٹنے کی ممانعت! تاہم اس نے لڑکے سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی۔ لڑکے نے عام سے انداز میں جواب دیا کہ بس یوں ہی، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کلاس کی کوئی بالغ لڑکی شب گناہ گزار کر کلاس میں آئی تو چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لیڈی کلاس ٹیچر نے اس سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے۔ طالبہ نے مزے لے لے کر ساری داستان سُنا دی۔ اس پر اُستانی صاحبہ کہتی ہیں کہ بھئی کچھ ہمارا خیال بھی رکھا کرو۔ ہمارے لیے بھی مواقع پیدا کرو۔ سارا کچھ تنہا نو نہ سمیٹو:

یہ ہیں مخلوط تعلیم کے برگ بار!

(۳) ہمارے ہاں جب مندرجہ بالا طرز کے واقعات کا ذکر آتا ہے تو لوگ تردید کے لیے یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ تو مغرب والوں کی باتیں ہیں، ہم تو مشرقی ہیں، پاکستانی ہیں، مسلمان ہیں، ایسی چیزیں ہمارے ہاں کاہے کو ہونے لگیں۔

مصیبت یہ ہے کہ معاشرت اور اخلاق کے بگاڑ کے جو قوانین تاریخ میں بار بار اپنا یکساں عمل کرتے رہے ہیں، لوگ اوّل تو ان پر غور ہی نہیں کرتے اور غور کرتے ہیں تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان قوانین کے تحت دوسروں کے ہاں جو نتائج بد نکلتے رہے ہیں، وہ ہمارے یہاں نہیں نکل سکتے۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر آپ مخلوط تعلیم کے دروازے سے داخل ہو کر مخلوط معاشرت کی راہ میں

گامزن ہوں تو چاہے آپ کتنے ہی محتاط ہو کر چلیں اور چاہے آپ کی رفتار کتنی ہی سست ہو، سنگ ومیل اور مراحل ومناظر تو وہی پیش آئیں گے جو اس راستے پہ آنے چاہییں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ چلیں تو مخلوط تعلیم ومعاشرت کی راہ پر، اور نتائج ملیں پردہ دارانہ نظام کے۔ چاہیے یہ کہ مغرب کے تکمیل کو پہنچے ہوئے تجربہ کے جملہ نتائج کو سامنے رکھ کر اندازہ کر لیں کہ آپ نے اگر اسی تجربے کا آغاز کیا ہے تو تدریجاً آپ کو پہنچنا وہیں ہے جہاں اہل مغرب پہنچے ہیں۔

یہاں ابھی چونکہ ابتدا ہے، تجربہ محدود ہے (اور کچھ مزاحمتی قوتیں بر سر عمل ہیں) لہٰذا یہاں مخلوط تعلیم کے ثمرات پوری طرح جھولیوں میں پڑے نہیں، مگر کچھ نہ کچھ واقعات واحوال ایسے ہیں جو آگے کے نتائج کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ مثلاً ابھی ابھی ماضی قریب میں لاہور کی ایک شہرت یافتہ درسگاہ کی متعدد طالبات ایک خوفناک اسکینڈل سے دوچار ہوئیں۔ یا مثلاً آصف حسین کی کتاب (THE EDUCATED PAKISTANI GIRL) میں ایک لڑکی کا مصنف سے بیان کردہ واقعہ یوں درج ہے کہ "ایک پارٹی کے موقع پہ اس نے ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر ایک جوڑا محبت کرنے میں مشغول تھا"۔ وضاحت کی گئی ہے کہ "یہ افلاطونی محبت نہ تھی" ایسے واقعات بھی ہیں کہ مخلوط تعلیم گاہوں کے پروفیسروں نے اپنی نوجوان شاگردوں سے دل ونگاہ کا رشتہ استوار کیا اور بالآخر نوبت شادی تک پہنچی۔ اس امر کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ نائٹ کلبوں، شراب خانوں، مخلوط ثقافتی تقریبوں اور رقص کی مجلسوں کا نشوونما ہمارے یہاں مخلوط تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ متوازی طور سے ہوا ہے یا نہیں؟ اور ان دائروں میں آنے والی ایسی خواتین یا لڑکیوں کی تعداد کیا ہے جن کی نسبت ثابت کو مخلوط تعلیم یا مخلوط معاشرت کے آتشیں ماحول میں بھجوا دیا گیا ہے۔

اس طرح کے سامنے آنے والے اور پس پردہ مخفی احوال وواقعات کو درکنار رکھ کر بھی دیکھیں تو مخلوط تعلیم کے بڑے خطرناک مضرات نمودار ہو رہے ہیں۔

ایک یہ کہ دو صنفوں کے بہم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں طرف بناؤ سنگھار کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ خاص طور سے لڑکیاں فیشن، ملبوسات اور سنگار کے سامانوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں۔ جنسی جذبہ مجبور کرتا ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اندر کشش (CHARM) پیدا کریں۔ اس مسابقت میں غریب گھروں کی بچیاں شکست کھا جاتی ہیں اور یا تو وہ غلط ذرائع سے اپنے آپ کو دوسروں کے برابر لانے کی کوشش کرتی ہیں یا احساس کمتری کے بوجھ تلے دب کر تعلیمی ترقی سے محروم ہو جاتی ہیں۔

مخلوط درس گاہوں میں معاشقوں کے تجربے بھی ہوتے ہیں - ان میں سے کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں ـــــ زیادہ تر غلط شکل میں - اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کی نگاہ میں تعلیم گاہ کی مخلوط سوسائٹی منگیتر حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی شکار گاہ ہوتی ہے - دونوں صنفوں کے افراد شکار کی تلاش میں رہتے ہیں ہیں، اور کبھی کوئی پسندیدہ چیز نشانے پہ آ جائے تو تیر چلا دیتے ہیں - اس اہم مقصد کے لیے لڑکیاں بسا اوقات اپنا بہت کچھ داؤں میں لگا دیتی ہیں اور بارہا کوئی نہ کوئی شکاری بظاہر اُن کا شکار بن کر خزانۂ عصمت لوٹ کر اپنی راہ لیتا ہے - اس قسم کے اشتعال انگیز ماحول سے نکلنے والے لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں اور خاندانوں اور محلوں میں طرح طرح کے پرابلم پیدا کر دیتے ہیں - خصوصاً انگریزی لٹریچر (اور اس کا چربہ پیدا کرنے والے اُردو لٹریچر) کو پڑھنے کی وجہ سے بڑا رومانٹک اور زندگی اور ماحول کے حقائق سے ماورا قسم کا ایک نظریۂ حسن، ایک تصورِ عشق اور ایک معیارِ ازدواج ان کے ذہنوں میں گھر کر لیتا ہے - عام قسم کے ناولوں اور ریڈرز ڈائجسٹوں کو پڑھنے کی وجہ سے وہ بعض فلمی اور ادبی سلوگنوں اور خاص خاص جملوں کو اپنا سرمایۂ ایمانیات بنا لیتے ہیں - لغتِ محبت کے خاص الفاظ اور اصطلاحات ان کے تخیلات میں نگینوں کی طرح جڑ جاتے ہیں - حساسیت حد سے بڑھ جاتی ہے - جس کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ افہام و تفہیم کرنے اور ٹھنڈے تدبر سے مسائل حل کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے - نتیجہ یہ کہ گھر گھر کے نظام وحدت کے بخیے اُدھڑنے لگتے ہیں - بات اگر حسب منشا نہ بنے تو پھر واحد راستہ خودکشی کا ہے - مخلوط تعلیم کے میکدے کے جرعہ نوش طالب علم ہوں یا طالبات، ایسے ایسے غلط رومانوی اقدام کر گزرتے ہیں کہ والدین بھائی بہنوں اور خاندان بھر کے لیے مصیبت پیدا ہو جاتی ہے - لڑکیاں گھروں سے نکل کر گھومنے اور نام نہاد ترقی پسند سوسائٹی میں گھلنے ملنے کی عادی ہو جاتی ہیں - وہ یا تو کسی حادثے کا شکار ہوتی ہیں یا رندی و ہوسناکی کے ان اڈوں کی رونق بن جاتی ہیں جو مغرب کے تہذیبی سامراج کی طرف سے ہمارے معاشرے کو تحفے میں ملے ہیں - اسی طرح جو نوجوان آوارہ نگاہی کے روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے آسیب بن جاتے ہیں -

مخلوط تعلیم (اور مخلوط معاشرت) کے دور دور تک پھیلے ہوئے بے شمار متفرق اثرات کو ہم یکجا سمیٹ کر دیکھ نہیں سکتے - کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اسے مجرد ایک پوائنٹ کی حیثیت سے لیتے ہیں کہ یہ تو بس ایک اتفاقی حادثہ تھا جو ہو گیا -

مخلوط تعلیم کے اداروں میں روزانہ چند گھنٹوں تک دونوں صنفوں کے گروہوں کا خلط ملط رہنا ایک غیر مختتم اعصابی تناؤ (TENSION) کا باعث بنتا ہے، اور اس طرح کا مسلسل اضافہ انداز ہونے والا اعصابی تناؤ ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور اخلاقی لحاظ سے بہت مضر اثرات رکھتا ہے۔ ان اثرات کا الگ الگ تجزیہ کر کے ماپنا تو ممکن نہیں، البتہ مخلوط تعلیم سے گذری ہوئی نئی نسلوں کے مجموعی کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ اندازہ کسی طرح بھی اُمید افزا نہیں ہے۔

ہمارے مغرب زدہ اور ترقی پسند خاندان جو اپنی اولادوں کو مخلوط تعلیم کے اسٹیج پر پہنچا کر ایک فاسد ماحول پیدا کرنے میں ممدو رہے ہیں، ان کو کیا پروا معاشرے کے غریب گھرانوں کی جن کی شرافت کیش اور پردہ پسند بیویوں اور بیٹیوں کے لیے ہر طرف ایک سیالی آگ پھیلتی جا رہی ہے۔ ان کا گھروں سے مجبوری باہر نکلنا تو درکنار رہا، خود گھروں کے اندر حفظِ ناموس سنگین آزمائش بن گیا ہے۔

بھارتی ماہرینِ تعلیم کا نقطۂ نظر

مناسب ہوگا کہ یہاں ہم بھارتی ماہرینِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے بھی خواتین پر مخلوط تعلیم اور مردانہ تعلیم کے اثرات کا جائزہ لیں۔

——— ہندوستان کے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن نے رادھا کرشن کی صدارت میں جو رپورٹ[1] مرتب کی تھی اُس میں سے دو ایک حوالے ملاحظہ ہوں۔

——— "عورتوں کی موجودہ تعلیم ان کی اصل زندگی سے سرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ صرف ضیاع کی صورت ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے اور نااہلیت پیدا کرنے کا باعث بھی۔"

——— "عورتوں کی تعلیم کا موجودہ نظام جو درحقیقت مردوں کی ضروریات کے لحاظ سے تشکیل دیا گیا ہے خواتین میں روزمرہ زندگی کے عملی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت و صلاحیت پیدا نہیں کرتا۔"

——— "نرسنگ اور ہوم اکنامکس کی تعلیم کو وہ ہتک سمجھتی ہیں۔ اور سائنس کے عہدوں میں مقابلہ کی خواہاں ہوتی ہیں۔"

---

[1] مخلوط تعلیم۔ احد انس صفحہ ۳۸ تا صفحہ ۴۱۔

——— "ایک ماہر تعلیم خاتون کی رائے تھی کہ انگلستان اور جاپان کے مخلوط اداروں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ان اداروں میں نہ مناسب توجہ دی جاتی ہے اور نہ خواتین کے لیے سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔"

گویا ہمارے پڑوس کی سیکولر اسٹیٹ نے بغیر کسی مذہبی بنیاد کے خالص دنیاوی نقطہ نظر سے مروجہ نظام تعلیم کو خواتین کے حق میں مضر پایا ہے۔

——— ایک اور حوالہ مغربی لٹریچر سے اخذ کردہ بھی ملاحظہ ہو۔

انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "یونیورسٹیوں میں کلیات کے شعبہ ہائے علوم کے چیئرمینوں کو ایک مستقل قضیہ درپیش ہے کہ طلبہ و طالبات ایک دوسرے میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکتے"[۱]۔

یہ ہے کیس مخلوط تعلیم کے خلاف جسے ہم نے چار نکات میں بیان کیا ہے۔ اب ذرا عقلی انداز سے سوچیے کہ یہ ساری اقوام کے لیے اور خصوصاً ہم مسلمانوں کے لیے کتنا ضرر رساں ہے۔ اس کے باوجود اگر نام نہاد ماڈرن طبقہ کے لوگ اپنا ووٹ مخلوط تعلیم کے حق میں ہی دیں تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ یا تو وہ مغربی نظریات اور اداروں کے حق میں اندھا تعصب رکھتے ہیں یا وہ ان سے شدید حد تک سحر زدہ ہیں۔

(باقی)

---

[۱] پردہ ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ ص ۱۰۱

دوسرا باب

تعزیراتِ اسلام

ثبوتِ سرقہ کے ذرائع

از جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب

(۳)

دفعہ ۴ | سرقہ موجبِ حد کا ثبوت ملزم کے اقرار یا شہادت کے ذریعہ سے ہوگا۔[1]

فصل اول: اقرار کے بیان میں

دفعہ ۵ | ا۔ اقرار کا اعتبار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملزم قاضی کے سامنے کم از کم ایک مرتبہ بغیر جبر و تشدد کے اقرار کرے۔[2]

ب۔ قاضی کے لیے بہتر یہ ہے کہ مُقِر کو اقرار سے رجوع کرنے کی تلقین کرے۔

ج۔ اقرار سے رجوع حد کو ساقط کر دیتا ہے خواہ حد کے اجراء کے دوران ہی میں کرے۔ لیکن مال کے حق میں اقرار سے رجوع مال کو ساقط نہیں کرے گا۔[3] البتہ اقرار سے رجوع کرنے پر اس کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

---

۱ تقضی بالقطع ببینۃ او اقرار۔ تنویر الابصار ص ۲۰۳ ج ۳ و عالمگیری ص ۱۸۲ ج ۲

۲ در مختار

۳ الرجوع بعد الاقرار انما لا یصح فی حقوق العباد المبسوط للسرخسی ص ۴۹ جلد ۹ مطبوعہ مصر۔ نیز ا ذا رجع فی خلال اقامۃ الحد فقال کذبتُ او ما زنیتُ او رجعتُ

(باقی برصفحہ ۲۵)

۵- اقرار بالجبر موجبِ قطع نہیں لیکن موجبِ مال ہے۔

۶- قاضی مُقِر سے یہ سوال کرے گا کہ:۔ ۱- چوری کس کو کہتے ہیں؟ ۲- تو نے کس شخص کی چوری کی ہے؟ ۳- کیا جنس چرائی ہے؟ ۴- چوری کیسے کی؟ ۵- کہاں سے کی؟ ۶- کتنی کی؟[۱]

اگر مالِ مسروقہ مجلس قضاء میں موجود ہو تو قاضی کا صرف اُس کو دیکھنا کافی ہوگا۔ جنس اور مقدار سے سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی[۲]

مذکورۂ بالا پانچوں اجزا کی تشریحات حسبِ ترتیبِ مذکورہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱- لغت میں اقرار کے معنی اثبات کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں اپنے اُوپر دوسرے کے حق کی خبر دینے کو اقرار کہا جاتا ہے[۳]

فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا قطع کے لیے ایک مرتبہ اقرار کافی ہے یا اقرار کے لیے تکرار کا ہونا ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اکثر علماء کے نزدیک ایک مرتبہ ملزم کا اقرار موجبِ قطع ہے۔ امام ابویوسفؒ کے پہلے قول کے مطابق دو مرتبہ اقرار کرنا ضروری تھا۔ مگر اس سے انہوں نے رجوع کرکے جمہور کی تائید کر دی تھی[۴]۔ امام احمدؒ اور امام زُفرؒ کے نزدیک ایک مرتبہ سے زائد اقرار کرنا ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہؒ وغیرہ حضرات کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مروی حدیث ہے جس میں مذکور

(بقیہ صفحہ سابقہ) سقط ما بقی من الحد عنه وکذٰلک السارق وشارب الخمر۔ مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۴۱ ج ۷ مطبوعہ ملتان۔ [۸] المحلی ج ۸ ص ۲۵۰۔

حاشیہ صفحہ ھذا۔ [۱] شامی و عالمگیری [۲] عالمگیری ص ۸۴، ج ۲

[۳] شامی باب الاقرار۔

[۴] یجب القطع باقرارہ مرۃ واحدۃ، ھذا عندھما وقال ابو یوسفؒ لا یقطع الا باقرارہ مرتین فی مجلسین مختلفین وروی عنه الرجوع الی قولھما (الجوھرۃ النیرۃ ص ۲۵۷ ج ۲ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان) و درمختار ص ۲۰۰ ج ۳

ہے کہ سارق نے ایک مرتبہ اقرار کیا کہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعِ ید کا حکم صادر فرمایا۔[1]

امام احمدؒ اور امام زفرؒ حضرت ابوامیہ مخزومی کی مروی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس میں مذکور ہے کہ آپؐ نے قطع کا حکم دو مرتبہ کے اقرار کے بعد دیا ہے۔[2]

ابوامیہ مخزومی کی حدیث سے ابوحنیفہؒ وغیرہ کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ سارق نے پہلے بعض صحابہ کرام کے سامنے اپنے جرمِ سرقہ کا اقرار کیا تھا، اس کو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تو یہ گمان نہیں کرتا کہ اس نے چوری کی ہے۔ اس پر سارق نے خود اقرار کر لیا کہ "ہاں یا رسول اللہ میں نے چوری کی ہے۔" چنانچہ آپؐ نے اس پر حد نافذ کرنے کا حکم دے دیا۔[3] اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ موجبِ قطع کے لیے قاضی کے سامنے ایک مرتبہ اقرار کرنا کافی ہے، اس لیے کہ سارق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے پہلے جو اقرار کیا تھا اس کو عدالت میں اقرار نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اقرار وہی معتبر ہو گا جو قاضی کے سامنے کیا جائے۔

ب۔ ابوامیہ کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہتر یہ ہے کہ قاضی مقر کو اقرار سے رجوع کرنے کی تلقین کرے۔ اس کی مزید تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک لونڈی لائی گئی جس نے چوری کی تھی۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ نہیں، اور آپؐ نے اس کو چھوڑ دیا۔[4] ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سارق سے پوچھا کہ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں۔ اس نے کہہ دیا کہ نہیں۔ تو آپؐ نے اس کو چھوڑ دیا۔[5]

---

[1] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۷۳ ج ۴ مطبوعہ ملتان [2] ابوداؤد ص ۲۶۲ جلد ۲

[3] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۷۲ ج ۷۔

[4] رواہ البیہقی بحوالہ سبل السلام علیٰ متن بلوغ المرام لابن الحجر العسقلانی ص ۲۳، جلد ۴، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ بمصر۔ [5] ایضاً

ج ۔ مذکورۂ بالا روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مُقِر جرم موجب حد کے اقرار سے رجوع کر لے تو حد ساقط ہو جائے گی، کیونکہ رجوع کرنے سے جرم کے وقوع میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے حد ساقط ہو جاتی ہے ۔ حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر رجوع اجراء حد کے دوران کیا جائے تو اس سے بھی حد ساقط ہو جائے گی۔ اُن کا واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے جرم زنا کے مرتکب ہونے کا اقرار کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جب اُن پر حد جاری ہونے لگی تو درمیان میں وہ بھاگ گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کو رجم کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ حد کے اجراء کے دوران بھاگ گئے تھے اور اس کے باوجود اُن کو رجم کیا گیا تو آپ نے رجم کرنے والوں سے ارشاد فرمایا کہ " هلا خليتم سبيله " یعنی تم لوگوں نے اُسے جانے کیوں نہ دیا؟ دوسری روایت میں ہے کہ " تم نے اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیا[1] "

لیکن چونکہ اُن کا رجوع کرنا صراحۃً نہ تھا اور بھاگنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ یہ درد سے بھاگے ہوں، اس لیے ان کو چھوڑا نہیں گیا۔ بلکہ رجم کر دیا گیا[2]۔ مگر اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حد کے اجراء کے درمیان میں بھی اگر مقر رجوع کرے تو بقیہ حد ساقط ہو جائے گی۔ یہ اصول حد سرقہ اور حد خمر سب کو شامل ہے[3]۔

اگر سارق نے اقرار سے رجوع کر لیا تو اس سے حد اگرچہ ساقط ہو جائے گی لیکن مال مسروقہ قابض مال کو واپس کرنا پڑے گا۔ بشرطیکہ اس کے پاس موجود ہو۔ ورنہ اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مال کے حق میں اقرار سے رجوع معتبر نہ ہوگا[4]۔

د ۔ پیچھے گذر چکا ہے کہ شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے اس لیے اگر سارق کو پیٹا جائے جس پر وہ جرم موجبِ حد کا اقرار کرے تو یہ جبری اقرار کہلائے گا جو موجب حد نہیں ہے۔ البتہ پٹائی سے اگر وہ مال کا اقرار کرلے تو اُس کو مال یا اُس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا[5]۔

[1] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۴۱ ج ۷، مطبوعہ ملتان   [2] ایضاً

[3] کذلك السارق وشارب الخمر ۔ مرقات ص ایضاً

[4] المبسوط للسرخسی ص ۱۹۱ ج ۹

[5] (قوله بصحة اقراره لا بها مكرها) ای فی حق الضمان لا فی حق القطع شامی ۲۰۱ ج ۳ ۔

سارق کو تہمتِ سرقہ کی وجہ سے مارنے اور اس پر جبر و تشدد کرنے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ متقدمین فقہا کے نزدیک سارق کو محض تہمت سرقہ کی وجہ سے مارنا پیٹنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ متاخرین فقہا کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ اس کے بارے میں جرم کا غلبۂ ظن حاصل ہو جائے اور یہ کہ مار اتنی سخت نہ دی جائے جس سے کہ ہڈی ظاہر ہو جائے۔

درحقیقت ان حضرات کا اختلاف اپنے اپنے زمانے کے حالات کے پیشِ نظر ہے۔ متقدمین فقہاء کا زمانہ نسبتہً خیر اور صلاح کا زمانہ تھا جس میں جھوٹ کا وجود تقریباً نایاب تھا۔ اس لیے انہوں نے محض الزام سرقہ سے ملزم کو پیٹنا جائز نہیں رکھا۔ اور متاخرین فقہا کے زمانہ میں لوگوں کی اخلاقی حالت پست ہو گئی۔ نیکی اور سچائی کا وجود نسبتہً کم ہو گیا۔ اس لیے انہوں نے الزام پر پیٹنے کو جائز رکھا۔ ورنہ گواہوں کے ذریعہ چوری کا ثبوت مشکل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ بعض معاہدین کی پٹائی کریں۔ اس لیے کہ انہوں نے حیی بن اخطب یہودی کا خزانہ چھپایا تھا حالانکہ اسی مال پر معاہدہ ہوا تھا۔ اس پر آپ نے ان کو پیٹا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں فساد کی کثرت کی وجہ سے متاخرین کے فتوے پر عمل کرنا چاہیے[1]

دوسری فصل (شہادت کے بیان میں)

اس فصل میں قانونِ شہادت کے جملہ احکام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ سرقہ سے متعلق خصوصی احکام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن شرائطِ شہادت کا جملہ مقدمات میں اعتبار کیا جاتا ہے اُن کا اعتبار یہاں بھی کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۶

۱۔ شہادت دیتے وقت شاہد کے لیے ضروری ہے کہ لفظ شہادت کے ساتھ گواہی دے۔ مثلاً یوں کہے کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اگر اس نے یوں کہہ دیا کہ " میں گواہی دیتا ہوں " تو یہ بھی صحیح ہے۔

تشریح ۔ گواہی لفظ شہادت کے ساتھ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر جو خصوصیات ہیں وہ کسی دوسرے لفظ میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی تین اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

---

[1] شامی ص ۲۰۱، ۲۰۲ ج ۳ مطبوعہ بولاق مصر۔

۱- یہ کہ اس لفظ کے اندر مشاہدہ یعنی آنکھوں سے دیکھنے کا معنی پایا جاتا ہے جو گواہی کی قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ گویا شاہد یوں کہہ رہا ہے کہ میں ایسی چیز کی گواہی دیتا ہوں جس کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔

۲- یہ کہ اس کے اندر قسم کے معنی بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ لفظ قسم کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً عربی محاورات میں کہا جاتا ہے " اَشْھَدُ بِاللّٰہِ لَقَدْ کَانَ کذا " یعنی " میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ بات اس طرح تھی "۔

۳- یہ کہ اس کے اندر حال کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنی " میں شہادت دیتا ہوں " زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے۔ اگر شاہد نے زمانہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا مثلاً یوں کہا کہ " میں نے گواہی دی "، تو اس کا اعتبار شہادت کے اندر نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ " اَشْھَدُ " " میں شہادت دیتا ہوں " ۔ مشاہدہ، قسم اور حال تینوں کو متضمن ہے اس لیے اس لفظ کے علاوہ کسی اور سے شہادت درست نہیں عہ

دفعہ ۳ | سرقہ، قطع الطریق (رہزنی) اور قصاص کے اندر کم از کم دو عادل مردوں کی شہادت ضروری ہوگی۔ ان مقدمات میں عورتوں کی شہادت قابلِ قبول نہ ہوگی عہ

البتہ حدود اور قصاص کے علاوہ دیگر مقدمات میں عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہوگی۔ بشرطیکہ عورتوں کے ساتھ کم از کم ایک مرد بھی گواہ ہو۔ اور عورتیں دو سے کم نہ ہوں عہ

نقشہ ہم :- حدود اور قصاص کی سزائیں بہ نسبت دوسرے جرائم کی سزاؤں کے زیادہ سخت ہیں۔ اس لیے ان کے ثبوت میں بھی سختی کی گئی ہے۔ زنا کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے لہٰذا اس کے ثبوت میں اور زیادہ سختی کی گئی ہے کہ چار عینی مسلمان گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ باقی حدود کی سزاؤں میں بھی سختی ہے مگر اس سے کم ہے تو ان میں صرف مردوں کی گواہی قبول کی گئی ہے۔ لیکن عورتوں کی گواہی کو ان مقدمات میں قبول نہیں کیا گیا۔ اس سے

عہ رد المحتار کتاب الشہادت ص ۳۸۵ ج ۴

عہ اخبرنا عبد الرزاق عن سفیان فی رجل وامرأتین شهدوا علی رجل انه سرق ثوبا ثمنه عشرون درهما قال نجيز شهادتهم فی المال، ولا نقطعه۔ مصنف عبد الرزاق ج ۱۰ ص ۳۱۸ مطبوعہ بیروت۔ وفی الشامیہ۔ المذکورة فی الشهادة فی الحد والقصاص ص ۳۸۵ ج ۴ ۔

عہ هدایہ کتاب الشهادة ص ۱۵۴ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی۔

بھی ثبوت میں شدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حضرت زُہریؒ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آپ کے دونوں خلفاء کے بعد تک سنت یہ چلی آ رہی ہے کہ حدود اور قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کو قبول نہیں کیا گیا۔[1]

دفعہ ۳ | گواہوں کا تزکیہ۔

ا۔ جب گواہ گواہی دے چکیں تو قاضی کے لیے ضروری ہو گا کہ اُن کا چال چلن خفیہ طریقے سے معلوم کرے بشرطیکہ قاضی ان کے چال چلن سے ناواقف ہو۔ اگر گواہ از روئے شرع معتبر ثابت ہوں تو اُن کی گواہی پر فیصلہ صادر کر دے۔[2]

ب۔ جن گواہوں کے حالات قاضی کسی دوسرے مقدمہ میں معلوم کر چکا ہو۔ اگر وہی گواہ اسی قاضی کے سامنے کسی اور مقدمہ میں شہادت کے لیے حاضر ہوں تو اُن کے حالات دوبارہ قاضی معلوم نہیں کرے گا بشرطیکہ چھ ماہ کے اندر حاضر ہوئے ہوں، ورنہ دوبارہ اُن کے حالات معلوم کرے گا۔[3]

تشریح:- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ۔ اس آیت سے واضح ہے کہ گواہ کا "مرضی" یعنی عادل ہونا ضروری ہے جیسا کہ دوسری آیت میں صراحۃً فرمایا۔ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدود اور قصاص کے مقدمات میں گواہوں کا چال چلن (تزکیہ) معلوم کرنا ضروری ہے۔ باقی مقدمات میں اگر فریق مخالف گواہوں پر کوئی عیب لگائے تو گواہوں کا تزکیہ کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک تمام مقدمات میں گواہوں کا تزکیہ کرنا ضروری ہے اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔[4]

قاضی کے لیے ضروری ہوگا کہ جب گواہ گواہی دے چکیں تو اُن کا تزکیہ کرے۔ اُن کے بیانات سے قبل تزکیہ نہ کرے۔ کیونکہ اس طرح سے مسلمان کی عیب چینی بلا ضرورت ہو گی جو ناجائز ہے۔ چنانچہ ایک مقدمہ

[1] الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ ص ۱۵۵ کتاب الشہادۃ۔

[2] در مختار ص ۳۸۸ ج ۴ [3] مجلۃ الاحکام العدلیہ۔

[4] ہدایۃ ج ۳ ص ۱۵۷ وشامی ص ۳۸۸ ج ۴۔

میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دو گواہ حاضر ہوئے اور گواہی دی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا "کہ میں تم کو نہیں جانتا اور میرا نہ جاننا تم کو کچھ نقصان بھی نہیں دیتا۔ تم ایسے آدمی کو میرے پاس لاؤ جو تم دونوں کو جانتا ہو۔ اس پر وہ ایک آدمی کو آپ کے پاس لائے۔ آپؓ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم نے ان کو کیسا پایا۔ اس نے کہا نیک اور امانت دار۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم ان کے پڑوسی ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؓ نے فرمایا کیا تم نے کبھی ان کے ساتھ سفر کیا ہے جس میں لوگوں کے اخلاق کھل کر سامنے آتے ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؓ نے فرمایا پھر تو تم ان کو نہیں جانتے۔ اس کے بعد آپؓ نے گواہوں سے کہا کہ تم ایسے آدمی کو لاؤ جو تم کو جانتا ہو۔[۱]

اس واقعہ سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ گواہوں کا تزکیہ اُن کے بیانات سننے کے بعد کیا جائے گا۔

۲۔ یہ کہ اُن کا تزکیہ اُن کے پڑوسیوں اور اُن کی سوسائٹی کے افراد کے ذریعے سے کیا جائے گا۔

۳۔ گواہوں کے تزکیہ میں صرف ان کے "عبادتی" پہلو کو ہی نہیں دیکھا جائے گا بلکہ ان کے معاملات کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔

۴۔ اگر گواہ عادل یعنی شرعاً قابلِ اعتبار ثابت نہ ہوں تو اُن کی گواہی کو مسترد کیا جائے گا۔

۵۔ گواہوں کا تزکیہ کرنے کے لیے ایک آدمی کافی ہے۔

۶۔ تزکیہ کرنے والا ایسا ہو جو گواہوں کے ظاہر و باطن سے پہلے سے واقف ہو۔ اس لیے کہ صحیح معنی میں وہی گواہوں کے کردار کا صحیح نقشہ پیش کر سکتا ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ علانیہ طور پر کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ قاضی کے سامنے مزکی گواہوں کا تزکیہ کرے۔ مگر فقہا نے فرمایا کہ وہ زمانہ خیر و صلاح کا تھا۔ اس زمانہ میں اس طرح کے تزکیہ سے کوئی حرج لازم نہیں آتا تھا۔ مگر آج کل یہ صورت بہتر نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرح کے تزکیہ سے یہ قوی اندیشہ ہے کہ گواہ تزکیہ کرنے والے کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے۔ اس لیے اس دور میں بہتر یہ ہے کہ

---

[۱] اعلاء السنن ص ۱۳۸ ج ۱۵ و المغنی والشرح الکبیر ص ۴۵۰ ج ۱۱۔ نیز دیکھیے المغنی ص ۴۴۰، ۴۴۱ ج ۱۱۔

خفیہ طور پر تزکیہ کیا جائے ۔ چنانچہ فتویٰ اسی پر ہے [1]

خفیہ تزکیہ کا طریقہ :۔ خفیہ تزکیہ ان سوال ناموں کے ذریعہ ہوگا جن کو فقہا کی اصطلاح میں مستورہ کہا جاتا ہے ۔

اس کی صورت یہ ہوگی کہ حاکم ایک کاغذ پر مدعی، مدعا علیہ اور جو دعویٰ ہے، وہ لکھے گا اور اس کے بعد شاہدوں کے نام، ان کے باپ دادا کے نام، ان کی سکونت اور ان کے حلیے، اور بہت مشہور لوگ ہیں تو ان کے نام اور ان کی شہرت کی صفت لکھنا ہی کافی ہوگا ۔ غرض یہ کہ وہ سب کچھ لکھ دے گا جس سے یہ پہچان لیے جائیں اور التباس باقی نہ رہے ۔

اس کے بعد اس کاغذ کو لفافے میں بند کر کے اس پر مہر لگا دے گا ۔ جن لوگوں کو تزکیہ کے لیے منتخب کیا جائے گا ۔ ان کے پاس یہ لفافہ بھیج دے گا ۔ وہ کھول کر اسے پڑھیں گے اور ہر گواہ کے نام کے نیچے اگر وہ عادل ہوں تو لکھیں گے ۔ عادل، مقبول الشہادۃ ۔ اگر عادل نہ ہوں تو لکھیں گے ۔ یہ عادل نہیں ہے اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر کے پھر لفافے کو بند کر کے اپنی مہر لگا کر حاکم کو واپس کر دیں گے ۔ یہ سب کچھ انتہائی راز سے کیا جائے گا ۔ لفافہ لانے اور لے جانے والے چپراسی یا کسی کو بھی اس کی اطلاع نہ ہونے دی جائے گی ۔

اگر مستورہ حاکم کے پاس مہر زدہ واپس آجائے اور اس پر کچھ نہ لکھا ہو، نہ یہ لکھا ہو کہ عادل اور مقبول الشہادۃ ہیں اور نہ یہ لکھا ہو کہ یہ عادل نہیں ہیں یا لامعلوم، مجہول لکھا ہو ۔ واضح طور پر یا اشارہ سے کوئی نقص ظاہر نہ کیا ہو تو حاکم ان کی شہادتیں قبول نہیں کرے گا ۔

اگر تزکیہ کرنے والے دو مرد ہوں تو زیادہ بہتر ہے ورنہ ایک بھی کافی ہے [2]

دفعہ ۹ | اگر شاہد شہادت دینے کے بعد مر جائیں یا غیر حاضر ہو جائیں تو قاضی کو اختیار حاصل ہے کہ ان کا تزکیہ کرے اور ان کی شہادتوں پر فیصلہ کر دے [3]

دفعہ ۱۰ | سرقہ اور دیگر حدود کے مقدمات میں گواہی پر گواہی کو قبول نہیں کیا جائے گا ۔ البتہ مالی حقوق کے بارے میں قبول کیا جائے گا [4]

---

[1] درمختار مع الشامی ص ۸۸۳ ج ۴ مطبوعہ بولاق مصر ۔ [2] مجلۃ الاحکام العدلیہ ۔ [3] ایضاً

[4] عالمگیری ص ۴۸۵، ۴۸۴ ج ۲ ۔ بدائع الصنائع ص ۸۱ ج ۷، مطبوعہ بیروت ۔

دفعہ ۱۱۱ قاضی گواہوں سے پوچھے گا کہ ملزم نے سرقہ کب کیا ہے؟ اس کے علاوہ باقی وہی سوالات گواہوں سے کرے گا جو اقرار کرنے والے سے کیے جاتے ہیں۔[۱]

شہادت کی میعاد

دفعہ ۱۱۲ الف۔ سرقہ، زنا اور شرب خمر کے مقدمات میں شہادت کی قبولیت کے لیے ضروری ہے کہ شاہد واقعہ کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر قاضی کے پاس واقعہ کی شہادت دے۔ البتہ اگر شاہد اس عرصہ کے اندر کسی معقول عذر کی بنیاد پر شہادت نہ دے سکے، مثلاً یہ کہ قاضی ایک ماہ کی دُوری پر رہتا ہو یا شاہد چلنے سے معذور ہو تو اس طرح کی تاخیر قبول شہادت میں مانع نہ ہوگی۔[۲]

ب۔ تمادی المیعاد شہادت قذف، قصاص اور مالی حقوق کے بارے میں مقبول ہوگی۔[۳]

تشریح:۔ عام مقدمات میں شہادت دینے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سے عدالت میں دعویٰ دائر ہو چکا ہو مگر خالص حق اللہ کے مقدمات میں یعنی سرقہ، زنا اور شرب خمر میں شہادت کی ادائیگی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ دعوٰی پہلے دائر ہو چکا ہو۔ لہٰذا ان مقدمات میں شاہد کو دونوں طرح کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ واقعہ کے فوراً بعد عدالت میں حاضر ہو کر واقعہ کی گواہی دے اور دوسرا یہ کہ وہ مجرم کی پردہ پوشی کرے جیسا کہ حدیث میں اس کی فضیلت بھی وارد ہے۔ تو اگر شاہد نے واقعہ کے بعد پردہ پوشی کی خاطر شہادت نہ دی مگر کچھ عرصہ کے بعد اس نے عدالت میں حاضر ہو کر شہادت دے دی تو یہ شہادت قبول نہ ہوگی اس لیے کہ اب شبہ پیدا ہوگا کہ شہادت ایک مرتبہ جب اس نے ترک کر دی تو اب دوبارہ اس پر آمادگی کینہ، حسد اور دنیاوی عداوت کی بنا پر ہوئی ہے۔ اسی شبہ کی وجہ سے شہادت قبول نہ ہوگی اور اگر اس نے بغیر عذر کے تاخیر کی تو اس سے شاہد فاسق ہو گیا۔ لہٰذا اب اگر وہ شہادت دے تو قبول نہ ہوگی۔[۴]

---

[۱] درمختار ص ۲۰۰ ج ۳

[۲] بدائع الصنائع ص ۸۱ ج ۷ مطبوعہ بیروت۔ و ہدایہ ص ۵۲۰ - ۵۲۱ ج ۲

[۳] بدائع الصنائع ص ۸۱ ج ۷

[۴] ہدایہ ص ۵۲۱ ج ۲

خفیہ طور پر تزکیہ کیا جائے۔ چنانچہ فتویٰ اسی پر ہے۔[1]

خفیہ تزکیہ کا طریقہ:۔ خفیہ تزکیہ ان سوال ناموں کے ذریعہ ہوگا جن کو فقہاء کی اصطلاح میں مستورہ کہا جاتا ہے۔

اس کی صورت یہ ہوگی کہ حاکم ایک کاغذ پر مدعی، مدعا علیہ اور وجہ دعویٰ ہے، وہ لکھے گا اور اس کے بعد شاہدوں کے نام ان کے باپ دادا کے نام ان کی سکونت اور ان کے حلیے، اور بہت مشہور لوگ ہیں تو ان کے نام اور ان کی شہرت کی صفت لکھنا ہی کافی ہوگا۔ غرض یہ کہ وہ سب کچھ لکھ دے گا جس سے یہ پہچان لیے جائیں اور التباس باقی نہ رہے۔

اس کے بعد اس کاغذ کو لفافے میں بند کر کے اس پر مہر لگا دے گا۔ جن لوگوں کو تزکیہ کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ ان کے پاس یہ لفافہ بھیج دے گا۔ وہ کھول کر اسے پڑھیں گے اور ہر گواہ کے نام کے نیچے اگر وہ عادل ہوں تو لکھیں گے۔ عادل، مقبول الشہادۃ۔ اگر عادل نہ ہوں تو لکھیں گے۔ یہ عادل نہیں ہے اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر کے پھر لفافے کو بند کر کے اپنی مہر لگا کر حاکم کو واپس کر دیں گے۔ یہ سب کچھ انتہائی راز سے کیا جائے گا۔ لفافہ لانے اور لے جانے والے چپراسی یا کسی کو بھی اس کی اطلاع نہ ہونے دی جائے گی۔

اگر مستورہ حاکم کے پاس مہر زدہ واپس آجائے اور اس پر کچھ نہ لکھا ہو، نہ یہ لکھا ہو کہ عادل اور مقبول الشہادۃ ہیں اور نہ یہ لکھا ہو کہ یہ عادل نہیں ہیں یا لا معلوم / مجہول لکھا ہو۔ واضح طور پر یا اشارہ سے کوئی نقص ظاہر نہ کیا ہو تو حاکم ان کی شہادتیں قبول نہیں کرے گا۔

اگر تزکیہ کرنے والے دو مرد ہوں تو زیادہ بہتر ہے ورنہ ایک بھی کافی ہے۔[2]

دفعہ ۹ | اگر شاہد شہادت دینے کے بعد مر جائیں یا غیر حاضر ہو جائیں تو قاضی کو اختیار حاصل ہے کہ ان کا تزکیہ کرے اور ان کی شہادتوں پر فیصلہ کر دے۔[3]

دفعہ ۱۰ | سرقہ اور دیگر حدود کے مقدمات میں گواہی پر گواہی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ البتہ مالی حقوق کے بارے میں قبول کیا جائے گا۔[4]

---

[1] درمختار مع الشامی ص ۳۸۸ ج ۴ مطبوعہ بولاق مصر۔ [2] مجلۃ الاحکام العدلیہ۔ [3] ایضاً

[4] عالمگیری ص ۴۸۵، ۴۸۲ ج ۳ ۵ بدائع الصنائع ص ۱ ۸ ج ۷، مطبوعہ بیروت۔

رُودادِ ابتلاء: احمد رائف مصری

جناب خلیل الحامدی صاحب

(۹)

ہم میں سے دو دو افراد کو ہتھکڑی پہنا دی گئی - اور ان سب ہتھکڑیوں کو ایک لمبی زنجیر میں پرو دیا گیا - یوں یہ پورا گروہ ایک مربوط قافلہ بن گیا جسے نہ صرف لوہے کی ہتھکڑیوں نے باہم مربوط کر رکھا تھا بلکہ درد و الم کا رشتہ بھی سب میں مشترک تھا - جلاد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھنا بھی نہ بھولے - یہ کام بھی انہوں نے کر ڈالا اور اسے کرنے کے لیے تشدد و توہین کے وہ تمام اسلوب اختیار کیے جو اُن کا معمول تھا - مثلاً لکد کوبی، فحش گوئی اور کمر زنی - چلتے وقت انہوں نے ایک اور وارننگ ہمیں دے دی - وہ یہ کہ "جو شخص راستے میں لب کشائی کریگا اُسے گولی مار دی جائے گی، اور اس کے ساتھ قطعاً رحمدلی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔" اس وارننگ کا کوئی وزن نہیں تھا - اس لیے کہ ہم میں سے کسی انسان کے اندر کوئی بات کرنے کی نہ خواہش تھی اور نہ سکت - ہم فوجی جیل کی طرف جا رہے تھے جہاں موت انتظار کر رہی تھی - اور موت بھی ہماری نظروں میں کوئی ایسی چیز نہ رہی تھی جس سے ڈرا جائے - بلکہ ڈر تھا عذابِ الیم کا -

ہماری اس کیمپ کے اندر دو فوجی سپاہی تھے - ہم خوف و دہشت کے مارے لرزہ بر اندام تھے اور وہ ہم سے ٹھٹھول کرتے تھے اور گالیوں سے ہمیں نوازتے تھے - ایک سپاہی بولا: "تم پر آسمان والے کا بڑا رحم ہوگا اگر تمہاری یہ پوری کیمپ نہر میں جا پڑے اور پوری کی پوری ڈوب کر مر جائے۔" اُس نے جب یہ بات کہی اُس وقت قیدیوں کی گاڑی اسماعیلیہ نہر سے گزر رہی تھی اور اُس کے آگے اور پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں - دوسرا سپاہی بھی بول اُٹھا کہ: "تمہیں کیا معلوم کہ جس جہنم کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تم پر کیا گزرنے والی ہے۔"

سپاہیوں کے الفاظ سُن کر میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مگر آہستہ آہستہ پورے سوز و درد کے ساتھ یہ دُعا جاری ہو گئی کہ خدا اِس سپاہی کی دعا قبول فرما لے۔ ہماری گاڑی نہر میں جا پڑے اور ہم سب غرق ہو جائیں بلکہ میں تو یہ تمنا بھی کرنے لگا کہ کیا اچھا ہوتا کہ مجھے گذشتہ روز پھانسی دی جا چکی ہوتی۔ مگر اللہ کا فیصلہ یہی تھا کہ کچھ اور باتوں کا بھی ہم تجربہ کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تمنا اور آرزو کے باوجود گاڑی نہر کا نوالہ نہ بنی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل میں جو تمنا اُبل رہی تھی وہی دوسروں کے دلوں میں تھی اور ہر شخص اللہ تعالیٰ سے ویسی ہی دُعا کر رہا تھا جو میں کر رہا تھا۔

اسماعیلیہ نہر (جسے ہم نہ دیکھ سکتے تھے) کے کنارے کنارے گاڑی چلتی رہی۔ گاڑی نے قاہرہ کی سڑکوں سے اُٹھنے والے شور و ہنگامہ کو بھی سُنا جو طرح طرح کی آوازوں کی شکل میں اُٹھ رہا تھا۔ اور یہ آوازیں اس بدقسمت کارواں سے بالکل بے خبر تھیں۔ راستے میں بعض پولیس اسٹیشنوں اور خفیہ پولیس کے مراکز پر بھی گاڑی تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رُکتی رہی۔ دو گھنٹے چلنے کے بعد یکایک ہمیں یہ محسوس ہوا کہ شور و غل دھیما ہو گیا۔ گاڑی کے انجن کی آواز کے سوا اور کوئی آواز ہمارے خوف و سراسیمگی میں حائل نہ ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ہم قصبہ نصر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ اسی جگہ وہ خوفناک فوجی جیل پائی جاتی ہے جس کی دیواریں سنگ و خشت کی اور دروازہ تیرہ و تار ہے۔ جہاں بڑی ڈھٹائی اور درندگی کے ساتھ انسانی آزادی کو چیلنج کیا جاتا اور قوم کا منہ چڑایا جاتا ہے۔

میرے دماغ میں شدید تہلکہ برپا تھا۔ میری روح سراپا بے تاب تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس قدر ایک انسان اپنے ہم جنس انسان کے ساتھ اس خوفناک جگہ پر جسے فوجی جیل کہتے ہیں سنگدلی کا برتاؤ کرتا ہے۔ آخر یہاں مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟ اور میں یہاں کیا کیا بھگتنے والا ہوں؟ گاڑی رُک گئی۔ خوف کے مارے یکایک میرا ذہن منجمد ہو گیا۔ اور پھر اس وقت احساسات میں تموّج پیدا ہوا جب آہنی زنجیر بجنے لگی اور میری ہتھکڑی مجھے باہر کی جانب کھینچنے لگی۔ ہم سب ایک ہی طویل زنجیر میں منسلک تھے۔ ٹھوس، گراں اور ٹھنڈی زنجیر جو قصبۂ نصر کی گرم اور خشک ہوا کے باوجود جسم و جان میں برودت پیدا کر رہی تھی۔

تیزی کے ساتھ ہم گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ میری دونوں آنکھیں بندھی ہوئی تھیں۔ میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی جو پہلے مدھم تھی اور پھر یکدم بالا ہو گئی اور پھر یہاں تک وہ خوفناک صورت اختیار کر گئی کہ کان پھٹنے اور جسم لرزنے لگا۔ یہ تازیانوں کی آواز تھی جو نہ صرف انسانی جسموں کے پرخچے اُڑا رہے تھے بلکہ ہوا کو بھی بُری طرح

چیر رہے تھے اور اس آواز کے ساتھ درندوں کی آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں بھی اٹھ رہی تھیں ۔ گویا روئے زمین کے تمام درندے یہاں ایک ہی میدان میں جمع ہو چکے ہیں ۔ ان تمام آوازوں کے اندر ایک انسانی چیخ بھی کانوں میں پڑ رہی تھی ، یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ یہ چیخ کسی مرد کی ہے یا عورت کی یا بچے کی ۔ فوجی جیل میں تینوں قسم کے انسان تازیانے کھاتے رہے ۔

ان لمحات میں میرا تخیل پکار اٹھا کہ دنیا کو بہرہ پن لاحق ہو چکا ہے ۔ تہذیب و تمدن کے جسد میں سڑاند پیدا ہو چکی ہے جس نے اس کی روح کو ناکارہ کر دیا ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے ۔

ہم فوجی جیل پہنچ گئے ۔ ہم گیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ قیود و سلاسل سے گراں بار ۔ آنکھیں بندھی ہوئی ۔ اسی اثنا میں فوجی آئے اور ہمیں تازیانوں کی ضرب سے اندر ہانک کر لے چلے ۔ یہ ایک نرالا اور عجیب و غریب منظر تھا ۔ میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا ۔ صرف تاریخ کی کتابوں میں جب ہم قدیم ترین ادوار کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس طرح کے مناظر ملتے ہیں ۔ مثلاً قدیم تہذیبوں کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسس غلاموں کی انقلابی تحریک کو کچلتا ہے اور ان کے لیڈر سپارٹاکس کو قتل کر دیتا ہے جس نے قدیم روما کو خطرے میں مبتلا کر دیا تھا ۔ رومیوں کے عہد میں لیبیا کی کوئلے کی کانوں میں بھی شاید ایسی مثالیں مل جائیں ۔ ان کانوں میں رومی حکمران غلاموں سے سارا دن ، اور رات کا کچھ حصہ مسلسل سخت کام لیتے تھے ، اور انہیں مضمحل اور نڈھال کر کے قتل کرتے تھے ۔ فاتح رمسیس نے بھی حبشیوں اور یونٹ کے علاقے سے جو قیدی گرفتار کیے تھے ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا تھا ۔ دورِ جدید میں سولھویں اور سترھویں صدی کے اندر روئی اور گنے کے کھیتوں میں مصر میں ایسی چند مثالیں مل سکتی ہیں ۔ تاریخ کے اور ادوار میں بھی آپ کوئی نہ کوئی ایسی مثال تلاش کر سکتے ہیں ۔ مگر بیسویں صدی کے اندر مصر میں اس طرح کے حالات کا عود کر آنا بڑا موجب حیرت ہے ۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تاریک حالات تہذیب و تمدن کے تاریخی مرکز کے اندر بھی پیش آ سکتے ہیں جہاں ہمیشہ مختلف افکار و نظریات کی تحریکیں برپا رہیں ۔ اور ہر نظریہ اور ہر تحریک انسان کی عظمت کے گن گاتی رہی اور انسانی آزادی کا علم بلند کرتی رہی ۔ مگر اب مرکز تہذیب کی یہ تصویر بن چکی ہے کہ راہزنوں کا ایک ٹولہ ملک میں دندناتا پھر رہا ہے ۔ یہ گھروں میں سے لوگوں کو اغوا کر لیتا ہے اور انہیں کسی گمنام اور تاریک جگہ لے جا کر ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے ۔ اڈولف ہٹلر ——— دنیا کے ملعون ترین انسان ——— کے عہد

میں بھی شاید گسٹاپو کے جلادوں کو انسانوں کی تذلیل اور تعذیب کی وہ قدرت حاصل نہ ہوگی جو ان رہزنوں کو حاصل ہے ——— یہ کیسی متعفن اور سرخ آندھی ہے جو ان گرمیوں میں مصر میں اُٹھی ہے۔

فوجی جیل میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی تاریک جنگل میں داخل ہو جانا جو آدم خور درندوں سے بھرا ہوا ہو۔ درندوں کے بارے میں بھی میرا خیال ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں جو دل دیا ہے وہ رحم و تلطف سے یکسر خالی نہیں ہے۔ مگر یہ رہزنوں کا ٹولہ جو سال بھر تک مجھے جیل کے اندر گوناگوں عذاب دیتا رہا، اس کا اندرون اس قدر کریہہ تھا کہ سوائے متعفن بگولوں کے اس میں سے کوئی چیز خارج نہ ہوتی تھی اور یہ بگولے ہر چیز کو بھسم کرتے جاتے تھے، اور ہر اس خوبی اور حسن کو ملیامیٹ کرتے جاتے تھے جو انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔

چیخ و پکار سے لبریز فضا کے اندر ایک گرجدار اور کرخت آواز بلند ہوئی:

یہ کیا جمگھٹا ہے؟

یہ نئے نظر بند ہیں پاشا صاحب۔ یہ نظر بند ابوزعبل کی جیل سے لائے گئے ہیں۔

ان کی آنکھوں پر تم لوگوں نے پٹیاں کیوں باندھ رکھی ہیں؟

پاشا صاحب، سول انٹیلی جنس کا یہی ضابطہ ہے۔

پاشا صاحب نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگایا اور کہا: سول انٹیلی جنس کے لوگ نظر بندوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتے ہیں کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ آئندہ یہ کہیں ان سے انتقام نہ لیں۔ مگر ہم تو عذاب دیتے ہیں اور قتل کر دیتے ہیں۔ عذاب بھی اور قتل بھی۔ ہمیں کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جو یہاں آئے اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ابدالآباد تک یا تو عبدالناصر کا غلام بے دام بن کر رہے (پاشا صاحب یہ فرما رہے تھے اور میرے ذہن میں قدیم مصر کے جادوگروں، فرعون اور ملک مصر کے مختلف مناظر گردش کر رہے تھے) اور یا پھر موت کا لقمہ بن جائے۔ اور اگر بالفرض وہ کسی ایسے سبب کی بنا پر جو ہمارے قابو سے باہر ہو، موت سے نجات پا جائے تو وہ زندگی بھر اس ملک بوس قلعے اور اس کی طرف آنے والے راستوں سے گریزاں رہے گا۔ پس ان چوہوں کی آنکھوں سے یہ غلیظ پٹیاں اُتار دو۔

ہمارے منہ جیل کی دیوار کی طرف کر کے ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ طوق و سلاسل کھول دیے گئے۔ اور ہمیں حکم دے دیا گیا کہ ہم اپنی آنکھوں سے پٹیاں اُتار دیں۔ پٹیاں کھولتے ہی یہ دیکھ کر لوگوں کی یوں

چیخیں نکلیں جیسے کوئی ماتمی جلوس گزر رہا ہو یا وہ ایک خوفناک کنویں کے اندر اتر گئے ہیں اور نہ معلوم اس کے اندر ان پر کیا گزرنے والی ہے۔ جب ہم نے فوجی جیل کے اندر قدم رکھا تھا تو تمام تر دہشت کے باوجود میرے اندر سوچ بچار کی بچی کھچی طاقت باقی تھی۔ اسی بچی کھچی طاقت کے بل پر میں نے ہر آرزو، ہر تمنا اور خوب یا زشت ہر خواہش کو الوداع کر دیا۔ اور یہ اندازہ کر لیا کہ میں آخرت کے دروازے پر کھڑا ہو چکا ہوں۔ اور اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے مشفق و مہربان ہاتھوں میں دے دیتا ہوں وہ جو چاہے کرے۔ جو بھی ہوگا بہتر ہوگا۔ آخرت بہتر ہی ہوگی۔ ہر چہ باداباد۔ اس کے ماسوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس موقع پر میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں یہ دو شعر پڑھے۔ شاعر کا نام معلوم نہیں ہے:

لاتدبر لک امرًا	اپنے کسی کام کی تدبیر نہ کر
فاولوا التدبیر ھلکیٰ	تدبیر کرنے والے تباہ ہوتے
سلم الامر تجدنا	اپنا کام ہمیں سونپ دے
نحن اولیٰ بک منک	ہم تیرے لیے تجھ سے زیادہ خیرخواہ ہیں

میں نے اپنے آپ کو اس جگہ پر اللہ تعالیٰ کا مہمان تصور کر لیا۔ حالانکہ یہاں کا ہر ذمہ دار شخص نعوذ باللہ خدائے عظیم و برتر کو چیلنج کر رہا تھا۔ بزرگ و برتر ہے اللہ کی ذات اور بابرکت ہیں اس کے نام۔

محترم قارئین میں یہاں کے بارے میں آپ کے سامنے کیا کیا بیان کروں۔ یہ روز ہائے سیاہ جب مجھے یاد آجاتے ہیں تو میرا رُواں رُواں کانپنے لگ جاتا ہے۔ اگر بھول کر بھی میری نظر ان ایام کی طرف اٹھ جائے تو اب بھی خوف و دہشت، الم و رنج اور غیظ و غضب کے جذبات کا سیل بے پناہ اُمڈ آتا ہے۔ فوجی جیل جس انسان کے بھی مقدر میں آئی ہے اُس نے وہ بُرے سے بُرے حالات دیکھے ہیں جن کا انسانی زندگی کے اندر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میرے احساسات کے مطابق دنیا کی تمام مصیبتیں مل کر اُس ایک رات کے مساوی نہیں ہو سکتیں جو فوجی جیل کی بھیانک اور ٹھنڈی کوٹھڑیوں کے اندر گزرتی ہے۔ میں جو کچھ تفصیل بیان کروں اور جتنا زورِ بیان دکھاؤں فوجی جیل کی منظر کشی اور وہاں کے حالات کی پوری عکاسی نہیں کر سکتا۔

فوجی جیل کی قدیم روایات میں سے ایک روایت مسلسل چلی آرہی ہے جسے جیل کی اصطلاح میں "استقبال" کہتے ہیں۔ یہ روایت فوجی جیل کا ہر جلاد اپنے جانشینوں کو سونپتا چلا آرہا ہے۔ اور اب مرورِ ایام کے ساتھ یہ نمایاں اور اہم حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ روایت یہ ہے کہ جلاد جب مصیبت زدہ قیدی

یا نظر بند کو وصول کرتا ہے تو اُسے لیتے ہی اس قدر شدت کے ساتھ مارتا ہے کہ بعض اوقات وہ زندگی سے محروم ہوجاتا ہے۔ جلاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گربہ کشتن روزِ اول کے اصول کی روشنی میں یہ نیا قیدی آئندہ کے لیے سراپا عجز و اطاعت بن جائے اور کبھی جلادوں کے سامنے سر اٹھا کے نہ چلے۔ "استقبال" کے مرحلے سے ہمیں بھی گزرنا تھا۔ اس کی ہولناک کہانیاں ہم ابو زعبل کی جیل میں سنا کرتے تھے۔ کیا میں "استقبال" کی تصویر آپ کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔ شاید نہیں۔ لیکن کوشش کروں گا:

فوجی جیل میں جب ہم داخل ہوئے تھے تو اُس وقت کیا فضا تھی، اِس کا مختصر خاکہ اُوپر بیان کرچکا ہوں۔ چیخیں بلند ہورہی تھیں، ہائے وائے کی آوازیں پھیل رہی تھیں، جگر دوز آہیں اٹھ رہی تھیں اور انسانی خون سے لت پت تازیانوں کی شائیں شائیں کانوں سے ٹکرا رہی تھی ——— ایسے میں چیرنے پھاڑنے والے کتے لائے گئے۔ ان کتوں کی گردنوں میں زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں اور سپاہیوں نے اُنہیں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ ان کتوں نے بھونکنا شروع کردیا۔ اور ہلکے ہلکے طریقے سے ہماری ٹانگوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ ہم دیوار کو چمٹے ہوئے تھے اور خوف و دہشت کے مارے پتھر بنے جارہے تھے۔ پھر سپاہیوں کی ایک تعداد بلائی گئی جو پچاس سے زیادہ تھی۔ اور اُن میں سے ہر شخص کو ایک مقررہ کرتب دکھانا تھا۔ یہ سپاہی بھی اسی طرح تربیت یافتہ تھے جس طرح یہ کتے۔ اور پہلے بھی اسی طرح کے کام سرانجام دے چکے تھے۔ جو کتوں کے کام سے مشابہ تھے، ہر سپاہی کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ ہم مصیبت زدگان کی قطار کے پاس سے گزرے اور ہم میں سے ہر شخص کی گدی پہ ایک مکہ رسید کرے۔ یہ مکہ کیا تھا گویا ایک بم تھا طاقت کے لحاظ سے بھی اور اذیت کے لحاظ سے بھی۔ میرے پہلو میں ایک آشفتہ حال بوڑھا کھڑا تھا، وہ اس مکّے کو برداشت نہ کرسکا اور فوراً زمین پہ ڈھیر ہوگیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ مکّے کی تاب نہ لاکر گرا یا شدتِ خوف سے۔ قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ وہ بے چارہ زمین پر گر پڑا۔ میں بے تابانہ اُس کی طرف جھکا۔ میرا دل جوشِ ہمدردی سے پھٹا جارہا تھا۔ بوڑھا بڑے دل گداز انداز میں سسکیاں بھر رہا تھا، اور خدا اور رسول کے واسطے دے رہا تھا، اور عجز و لجاجت کے ساتھ رحم کی اپیل کررہا تھا۔ اسی حالت میں وہ یک بیک خاموش ہوگیا۔ ہمیشہ کے لیے خاموش۔ مجھے یقین ہے کہ خوف و دہشت کی شدت سے اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

مجھے قطار میں سے الگ کرلیا گیا اور سب لوگ مل کر مجھے زدوکوب کرنے لگے یہاں تک کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں کے اندر گوشت کے ڈھیر میں پایا۔ ہم سب کو

مارا گیا تھا اور خوب مارا گیا تھا۔ یہاں تک کہ شدتِ جذبات سے ہم لوگ گوشت کا ڈھیر بن چکے تھے۔ کتے بڑے بھیانک اور وحشیانہ طریقے سے ہمارا خون چاٹ رہے تھے۔ اس رات کتوں نے کس قدر انسانی گوشت کھایا اور انسانی خون پیا یہ بیان سے باہر ہے۔

ہم راکھ کا ڈھیر بنے پڑے تھے کہ سپاہی چلا کر کہنے لگے کہ ہم کھڑے ہو کر نئے احکام سنیں۔ چنانچہ شدتِ آلام کے باوجود ہمارے لیے تعمیلِ حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم کھڑے تو ہو گئے مگر ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ سراپا شکایت، سراپا دُکھ اور سراپا بے چارگی و ضعف تھا۔ حکم یہ صادر ہوا کہ ہم اس جگہ کی طرف مارچ کریں جہاں رات گزارنی ہے۔ دُنیا کی دوزخ کی پہلی رات۔ اس نئے حکم کے تحت ہم اس حصے کی طرف چل دیے جسے "بڑی جیل" کہا جاتا تھا۔

فوجی جیل کے چاروں طرف ایک اونچی دیوار ہے۔ اس کے اندر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ عمارتیں نمبروں کے ساتھ موسوم ہیں۔ نمبر ایک عمارت "بڑی جیل" کہلاتی ہے۔ اس میں ٹھونس ٹھونس کر ایک ہزار آدمی بھرے جا سکتے تھے۔ اس کے اندر تقریباً تین سو کوٹھڑیاں ہیں۔ اور یہ تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ اسی جگہ میں نے اپنی نظر بندی کی مدت بسر کی ——— نمبر ایک کے بعد، نمبر دو، نمبر تین، نمبر چار...... پھر اسپتال ہے جس میں وہی شخص داخل ہوتا ہے جو موت کے دروازے میں قدم رکھ چکا ہو۔ یا وہ بالفعل مر چکا ہو۔ پھر انتظامیہ کے دفاتر ہیں اور ان کے ساتھ ہی تعذیب گاہیں۔ فوجی جیل کے اندر ہی ایک خوبصورت اور نفیس بنگلہ ہے جس میں جیل کا جلاد اعظم حمزہ البسیونی رہتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے کہ جب تاریخ کے اندر تشدد، قتل، تعذیب اور تذلیل کے ابواب لکھے جائیں گے، تو یہ شخص ہر باب کا سرنامہ ہو گا۔ ان عظیم عمارتوں کے وسط میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو افسردگی و ندامت کے ساتھ محوِ سکوت ہے۔ اور حیرت کی نظروں سے اُن تمام واقعات کا مشاہدہ کر رہی ہے جو اس کی نظروں کے سامنے سرانجام پا رہے ہیں۔ جیل کی ڈیوڑھی میں جہاں ہمارا تین گھنٹے تک "استقبال" کیا گیا اور بڑی جیل کے درمیان جہاں ہم رہ رہے ہیں، تقریباً دو سو پچاس میٹر کا فاصلہ ہے۔

ہمیں حکم ملا کہ ہم بڑی جیل کی طرف جانے والا راستہ رہنما کے بغیر طے کریں حالانکہ یہ راستہ پیچ در پیچ تھا۔ اور ہم اس سے ناواقف تھے۔ سپاہیوں کے تازیانے ہمیں ہانکتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ اور ہر شخص کو حکم تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی گردن پر مکہ رسید کرے۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کے لیے سراسر

تباہی اور بربادی ہے۔ ہم بڑی جیل کے میدان میں مار کھاتے ہوئے شکستہ و پژمردہ پہنچ گئے۔ یہ معلوم کر کے ہمارا خوف اور شدید ہوگیا اور ہم پر دہشت مزید طاری ہوگئی کہ ہمیں ایک اور "استقبال" سے گزرنا ہے۔ یہ مقامی استقبال ہے جو بڑی جیل کے میدان میں ترتیب دیا جائے گا۔

یہ میدان وسیع اور چوکور ہے۔ اس کا عرض ایک سو پچاس میٹر ہے۔ اس میدان کے ایک گوشے میں ——— جہاں مصر کے بے شمار فرزندان اسلام قتل کیے گئے ——— ایک کنواں ہے۔ جو بڑی جیل کے دروازے کے دائیں جانب واقع ہے۔ یہ کنواں پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس کی منڈیر کے پاس لوہے کی ایک مستطیل میز ہے جہاں بالعموم جیل کے پہرہ دار بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم اس میدان میں داخل ہوگئے اور تعمیل احکام کے طور پر ہم نے دیوار کی جانب منہ کر لیے۔ پہرہ داروں کی ایک جماعت جو کھانے پینے میں مشغول تھی سرعت کے ساتھ ہماری طرف بڑھی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ پہرہ دار سپاہی کھانے پینے کی اشیاء پر جو انہوں نے قیدیوں سے چھینی ہوتی ہیں سوائے تعذیب کے کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھانا چھوڑ کر ہماری طرف لپکے تاکہ کھانے سے بھی زیادہ "مرغوب غذا" سے محظوظ ہوں۔ یعنی ہمیں ٹھوکریں مارنے، تازیانے لگانے اور دیگر طریقوں سے آزار پہنچانے کی لذت حاصل کریں۔ اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے منحرف الفطرت انسان ملیں گے جنہیں انسانی خون کی لت لگ جاتی ہے اور وہ جب تک اپنی اس لت کو پورا نہ کرنے رہیں چین سے نہیں سو سکتے۔

بڑی جیل کی "استقبالیہ محفل" دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ استقبال ویسا ہی تھا جیسا ملٹری پولیس میں کیا گیا۔ لیکن وحشت و درندگی کے لحاظ سے یہ اس سے فوقیت لے گیا۔ ہماری نقدی ہم سے لے لی گئی، ہاتھوں میں سے گھڑیاں بھی اتار لی گئیں، قلم بھی رکھوا لیے گئے۔ اور بعض اچھے اچھے کپڑے جو سپاہیوں کو پسند آئے انہوں نے چن لیے اور پھر ہمیں سٹور نمبر۱ میں بند کر دیا گیا۔ اس حال میں کہ شکستہ و کوفتہ تھے۔ بھوکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کوئی بلا اس دنیا سے ہمیں اچک کر لے جائے گی۔

(باقی)

مطبوعات

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سیاسی مکتوبات

مرتبہ: جناب آباد شاہ پوری صاحب
صفحات: ۲۲۴ — کتابت و طباعت آفسٹ
قیمت: -/۹ روپے
ناشر: مکتبۂ چراغِ اسلام - اُردو بازار لاہور

جناب آباد شاہ پوری کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب اور کہنہ مشق انشاء پرداز ہیں۔ وہ کئی ایک علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں جو اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے بڑی محنت و کاوش اور دیدہ ریزی سے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کے اُن مکتوبات کا انتخاب کیا ہے، جن سے اُن کی سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں مختصر مگر جامع انداز میں "صاحبِ مکتوبات" حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات و کمالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز "حضرت مجددؒ کا سیاسی کارنامہ" پر ایک مفصل اور فکر انگیز مقالہ شاملِ کتاب ہے۔ اس مقالہ میں حضرت مجددؒ کے دَور کے دینی رجحانات اور سیاسی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اِس تناظر میں حضرت مجددؒ کے سیاسی مکتوبات کا مطالعہ اُن کی اہمیت اور اصل روح کو واضح کرتا ہے۔ دراصل یہ پُرمغز مقالہ حضرت موصوفؒ کے مکتوبات کو سمجھنے کے لیے شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

شہنشاہِ اکبر جس وقت "حریم نبوت" میں داخل ہونے کی سعی کر رہا تھا، "دینِ الٰہی" کے عنوان سے اخلاقی، معاشرتی اور اجتماعی شعبوں میں خلافِ شریعت احکامات نافذ کر رہا تھا، "حلال و حرام اور منکر و معروف" کی ایک نئی شریعت وضع کر رہا تھا اور شہر سے باہر "شیطان پورہ" کی ایک آبادی قائم کر کے سرکاری طور پر عصمت فروشی کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا، حضرت مجدد الف ثانیؒ مختلف امراء و اعیانِ سلطنت کو خطوط کے ذریعہ ان خلافِ شریعت سرگرمیوں پر اُن کو تنبیہ کرتے ہیں، اُن کو ترویج و نفاذ شریعت کی ترغیب دلاتے ہیں اور اکبر کو

راہِ راست پر لانے کی نصیحت فرماتے ہیں ۔ یہ وہ سیاسی سرگرمیاں تھیں جن کے مرتکب اس جمہوری دور میں بھی غدار اور باغی قرار پاتے ہیں ۔

حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے اُن کی سیاسی بالغ نظری کا پتہ بھی چلتا ہے ۔ اربابِ اقتدار کو دین کی ترویج واشاعت یا اُس کی تحریف و تخریب میں جو عمل دخل حاصل ہے ، حضرت مجددؒ اُس کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ خانِ جہاں کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ۔

"...... آپ جانتے ہیں بادشاہ روح کی مانند ہوتا ہے اور باقی انسان جسم کی مثال ۔ اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح اور سالم رہتا ہے ۔ اور اگر روح میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو سارا جسم اس بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کرنے کے مترادف ہے ۔ (ص ۱۱)

خانِ اعظم کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں " دانشمندوں کا قول ہے اَلشَّرْعُ تَحْتَ السَّیْفِ ۔ شریعت تلوار کے نیچے ہے ۔ یعنی شریعت کا اجرا اور اُس کی رونق بادشاہوں سے وابستہ ہے ۔ (ص ۱) " ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ شریعتِ اسلامی کی ترویج کو سب سے بڑی نیکی تصور کرتے ہیں اور یہ کارنامہ جس کامیابی کے ساتھ اربابِ اقتدار سرانجام دے سکتے ہیں ۔ کوئی دوسرا اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ خانِ جہاں کو لکھتے ہیں :-

" یہی خدمت (تدبیر سلطنت) جس پر آپ فائز ہیں اگر اس سے شریعتِ مصطفوی کی ترویج و اجرا کا کام لیں گے تو گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کام کریں گے اور دینِ متین کو منور اور آباد کریں گے ۔ ہم فقیر اگر سالہا سال تک اس راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان بھی دے دیں تب بھی آپ جیسے شاہبازوں کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتے " (ص ۱۵) ۔

کتاب کے آخر میں " شخصیات " کے تحت اُن تمام اہل شخصیتوں کے جامع حالات درج ہیں جن کا اس کتاب میں کسی حیثیت سے بھی ذکر آیا ہے ۔

فاضل مرتب اپنے اس دعوٰی میں حق بجانب ہیں کہ " کتاب کا یہ حصّہ بجائے خود ایک مستقل علمی و ادبی اہمیت اپنے دامن میں رکھتا ہے " (ص ۱)

کتاب میں ایک دو مقام پر کتابت کی غلطیاں نظر پڑی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔

ص ۱۴۱ پر سورہ کی جو آیت درج کی گئی ہے اُس میں " اِنْ یَّعِدْکُمْ " کے بجائے " اَنْ یَّعِدْکُمْ " درج ہو گیا ہے ۔

ص ۱۰ پر " شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا " کے بعد " وَکُلُّ مُحْدَثَةٍ " کے الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں ۔

شاہراہِ مکہ مؤلف: ڈاکٹر ایچ - بی - خان صاحب -

صفحات: ۲۹۸ - طباعت وکتابت عمدہ

کاغذ: سفید قیمت: -/۳۰ روپے

ناشر: نورسی پبلیکیشنز. کراچی ۱۹ ناظم آباد کراچی ۱۸

مکہ معظمہ جو خانہ کعبہ کا مسکن ہے، ہمیشہ سے اہلِ دل اور صاحبِ ایمان حضرات کی عقیدت و محبت کا مرکز و محور رہا ہے اور یہاں سے ہمیشہ رشد و ہدایت کے چشمے اُبلتے رہے ہیں اور آج بھی بے چین روحوں کے لیے طمانیتِ قلب کا سامان ہے۔ ابتدائے آفرینش سے مختلف ادوار میں تحریکِ اسلامی کی جتنی لہریں بھی اٹھیں بیت اللہ نے اُن میں تحریک و توسع پیدا کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ آخری تحریک اسلامی، جس کے قائد و سالار سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ مکرمہ میں جنم لیا اور پھر خانہ کعبہ ہی کی دیواروں کے سائے میں پروان چڑھی۔ نیز کعبۃ اللہ آج اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُمتِ مسلمہ کی باہمی آہنگی اور یگانگت کی علامت بھی ہے۔

"شاہراہِ مکہ" اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ فاضل مؤلف نے اسی نقطۂ نظر سے کعبۃ اللہ کا تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ اور یہاں سے اُٹھنے والی ہر تحریکِ اسلامی کے عروج و کمال کا تذکرہ کیا ہے۔ خصوصاً نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو تحریک پروان چڑھی، اُس کے امتیازی خدوخال کو بیان کیا ہے اور اُس کی جن منفرد اور دلکش خصوصیات نے ایک دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا اُن کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اسلام کس تہذیب کا علمبردار ہے؟ اُس کے مابعد الطبیعاتی عقائد و نظریات کیا ہیں؟ زندگی کے بارے میں اُس کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اُس کا فلسفۂ روحانیت کیا ہے؟ اسلام کے زیرِ اثر مسلمانوں نے فلسفہ، حکمت، طب، ریاضی، جغرافیہ، ہندسہ اور دیگر علومِ طبیعی میں کیا خدمات سرانجام دیں؟ فاضل مؤلف نے ان تمام پہلوؤں پر اجمالی مگر جامع نظر ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریکِ اسلامی کے خلاف ہونے والی مختلف سازشوں سے بھی نقاب اٹھایا ہے۔ خصوصاً اسرائیل کی ناجائز یہودی ریاست کی تشکیل و تعمیر کے محرکات اور اُس کی پشت پناہ قوتوں کی تفصیل نشان دہی کی ہے۔

"شاہراہِ مکہ" میں عرب دنیا میں اُٹھنے والی معروف اسلامی تحریکوں سنیوسی تحریک اور تحریکِ وہابی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان تحریکوں کے مطالعہ سے قاری مختلف مسلم مملکتوں کے تاریخی اور سیاسی حالات سے بھی روشناس

ہوتا ہے۔ اس کتاب کی محرک ایک نومسلم فاضل علامہ محمد اسد کی کتاب (ROAD TO MECCA) ہے۔ چنانچہ "شاہراہِ مکہ" میں اِس کتاب کے اکثر اقتباسات شامل کر دیے گئے ہیں۔ فاضل مؤلف نے علامہ اسد کی کتاب میں جو فروگذاشتیں محسوس کیں اُن کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے "شاہراہ مکہ" کو علامہ اسد کی انگریزی کتاب کا ترمیم و اضافہ شدہ اُردو ایڈیشن قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اِس علمی و تحقیقی کتاب کے حسن کو البتہ بعض اغلاط نے گہنا دیا ہے۔ کتاب میں درج قرآنی آیات پر اعراب کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ہم چند مقامات کی نشاندہی ضروری سمجھتے ہیں۔

ص۵ پر رَهْبَانِيَّة کی املا اس طرح ہے رَهُبَانِيَّة جو غلط ہے۔

ص۵ پر جو حدیث نقل کی گئی ہے اس کے اعراب غلط ہیں مِنَّا کو مَنَّا اور مَنْ کو مِنْ لکھا گیا ہے۔ نیز پہلے جملے میں لفظ "مَاتَ" زائد ہے۔

ص۱۰ پر ایک روایت درج ہے جس میں اِلَى اللَّحْدِ کو اِلَى التَّحَدُ لکھا گیا ہے۔

ص۱۲۵ پر سورہ اعراف اور رحمٰن کی جو آیات درج ہیں اُن میں لَآ اَمْلِكُ کو لَآ اَمُلِكُ اور ضَرًّا کی جگہ ضَرٌّ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف کی آیت میں اَلْغَيْبُ کے بجائے اَلْغَيْبَ (مفتوح) ہونا چاہیے۔

ص۱۲۷ پر ایک آیت "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" میں اِخْوَةٌ کے بجائے اِخْوَانٌ لکھا گیا ہے۔

ص۱۲۸ پر سورہ بروج کی آخری آیت اس طرح درج ہے "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٌ" جو "فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" ہونی چاہیے۔

اِسی طرح بعض جملے ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی غیر معیاری اور ادھورے رہ گئے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ص۱۰: عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی اسلام سے دُوری کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں "اس کی کئی وجوہات ہیں ان میں سے کچھ تو یہ ہیں کہ سیاسی و اجتماعی مسائل جنہوں نے موجودہ زمانہ میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔"

ص۱۷: "اِس کتاب کی دستیابی اس سلسلہ کا ایک اہم جزو اور معنی خیز ہے۔"

صد ۱۸ "..... اسلامی تہذیب وتمدن کے خدوخال اور اُن کے حسن وقبح کے تفصیل کے سامنے پیش کرنے کے لیے زور آزمائی کی ہے۔

صد ۲۲ "..... کوئی نہ کوئی ہادی یا رسول و پیغمبر آتا رہا تاکہ اس گروہ، قوم یا مخصوص مقامات کے افراد کی رہنمائی وہدایت (تنذیر و تبشیر) احکاماتِ الٰہیہ کے تحت کرے"۔ تنذیر و تبشیر کے الفاظ رہنمائی وہدایت کے مترادفات کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔

صد ۲۲۔ "اپنی صلاحیتیں اور پوری توانائی" ۔ "توانائیاں" ہونا چاہیے۔

صد ۲۲۔ "ان ہادیانِ برحق میں سے جن کے متعلق قرآن مجید میں درج ہے، اُن کے بارے میں ضمنی طور پر چند کے متعلق اجمالی حالات پیش کئے جا رہے ہیں"۔

صد ۲۳ "جزا و سزا کی تنذیر و تبشیر" میں لف و نشر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ صحیح صورت یہ ہوگی "جزا و سزا کی تبشیر و تنذیر"۔

صد ۲۴ اور صد ۲۵ پر "قمر و ستارہ" اور "چاند و سورج" کے مرکبات صحیح نہیں۔

صد ۹۱ "مغربی تہذیب سے مراد یہ ہے کہ یورپین اقوام کی مدنی زندگی، معاشی و معاشرتی، اخلاقی، علمی، جنسی اور صنعتی و حرفتی وغیرہ وغیرہ"۔ اس سے کوئی کیا سمجھے؟

صد ۹۰ پر فاضل مؤلف تحریر کرتے ہیں "عصرِ حاضر میں عیسائی تہذیب کی مثال دجال سے مشابہت رکھتی ہے، یعنی دجال ایک آنکھ کا مالک دنیاوی اُمور کی انجام دہی میں قادر اور قدرت رکھنے والا ہوگا۔ ایک آنکھ سے مراد کردہ دنیاوی فلاح و ترقی کی طرف مائل ہوگا....."۔ دجال کی یہ تعبیر و تشریح طبع زاد اور مؤلف کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا تسامحات کے باوجود کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

(بقیہ اشارات)

باتیں اور بھی ہیں، مگر باقی پھر کبھی!

ہماری درخواست ہے کہ ان معاملات کے متعلق سربراہ مملکت اپنی کسی قریبی فرصت میں فیصلہ و اعلان کریں۔ جس حسنِ ظن اور خیر خواہی سے یہ سطور لکھی گئی ہیں، اُمید ہے کہ ان کی قدر کی جائے گی۔

آخر میں دُعا ہے کہ خدا سربراہ مملکت کو اسلام کی خدمت کے لیے مومنانہ بصیرت اور اخلاص اور مجاہدانہ جذبۂ کار عنایت کرے۔ اور وہ ایک لمبے دَورِ فترت کے بعد احیائے نظام اسلامی کے پہلے کامیاب سپاہی ثابت ہوں۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی صاحب کا بیان

۲۔جنوری۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءُ الحق کا یہ اعلان نہایت قابلِ قدر ہے کہ اب اعلیٰ عدالتیں ہر ایسے قانون کو کالعدم قرار دینے کی مجاز ہوں گی جو قرآن و سنّت کے خلاف ہو۔ اس کارِ خیر پر میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مَیں اُن کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ سپریم کورٹ اور ہر ہائی کورٹ کو شرعی احکام کی تحقیق میں مدد دینے کے لیے کم از کم ایک ایک مفتی مقرر کر دیں۔ اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ہمارے لاکالجوں سے عربی جاننے والے اور فقہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے والے جج اور وکلاء تیار ہو کر نکلنے نہ شروع ہو جائیں۔

تفہیم القرآن

[illegible]

[illegible]

تفسیر تیسواں پارہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

بنیادی حقوق

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور